اُردو شاعری کا نچوڑ

غزلستان

مشہور و ممتاز شعراء و شاعراتؒ کی نمائندہ غزلیں

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیب رامپوری

اُردو شاعری کا نچوڑ

غزلِستان

مشہور و ممتاز شعرا و شاعرات کی نمائندہ غزلیں

—— ترتیب وانتخاب ——

فرخندہ ہاشمی — نجیبؔ رامپوری

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
NEW DELHI-110002

HaSnain Sialvi

نام کتاب

اُردو شاعری کا نچوڑ غزلستان

ترتیب و تالیف:

فرخندہ ہاشمی/نجیب رامپوری

صفحات: ۳۲۰ قیمت: -/۶۰ روپے

طبع اوّل: مارچ ۲۰۰۳ء

باھتمام

محمد ناصر خان

Name of the book

GHAZALISTAAN

Compiled by Farkhanda Hashmi, Najeeb Rampuri

Pages: 320 Size: 20x30/16

Price: Rs. 60/-

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دینی و دیگر علمی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور طباعت سے قبل کوشش کی جاتی ہے کہ نشاندہی کی جانے والی جملہ غلطیوں کی بروقت تصحیح کر دی جائے۔ اس کے باوجود غلطیوں کا امکان باقی رہتا ہے۔

لہٰذا قارئین کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ علمی غلطیوں کی نشاندہی کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں تعاون کرنا صدقہ جاریہ کے مترادف ہے۔ (ادارہ)

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House Darya Ganj, N. Delhi-2
Phones: 23289786, 23289159 Fax: 23279998 Res: 23262486
E-mail: farid@ndf.vsnl.net.in Websites: faridexport.com, faridbook.com

Printed at: Farid Enterprises, Delhi-6

پس پردہ

ولی دکنی

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

نہ چھوڑے محبت دم مرگ تک
جسے یار جانی سوں یاری لگے

نہ ہوئے اسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشقِ پاک کوں
پیارے تری بات پیاری لگے

ولی کوں کہے تو اگر یک بچن
رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

شاہ حاتم

تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے
جہاں کے کام تھے جتنے، تمام بھول گئے

گئے تھے زعم میں اپنے پر اُس کو دیکھتے ہی
جو دل نے ہم سے کہے تھے پیام بھول گئے

تری طرف ہوئی صورت گرانِ چیں کی نگاہ
قلم کو ہاتھ سے رکھ اپنا کام بھول گئے

تری بہ زلفِ گرہ گیر دیکھ کر صیّاد
شکار آپ ہوئے، صید و دام بھول گئے

بڑا غضب ہے کہ حاتمؔ کو تم نہ پہچانے
وہی قدیم تمہارا غلام، بھول گئے

سوداؔ

گُل پھینکے ہے اَوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی!
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی!

کیا ضد ہے مرے ساتھ، خدا جانیئے! ورنہ
کافی ہے تسلّی کو مرے ایک نظر بھی

اے اَبر! قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی!

کس ہستیٔ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شامِ سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

سوؔدا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

○

نَے بلبلِ چمن نہ گلِ نَو دمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخِ بُریدہ ہوں

گریاں بہ شکلِ شیشہ و خنداں بہ طرزِ جام
اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں

تو آپ سے زباں زدِ عالم ہے ورنہ میں
یک حرفِ آرزوئے بلب نارسیدہ ہوں

کوئی جو پوچھتا ہو تو کس پہ ہے داد خواہ
جوں گل ہزار جا سے گریباں دریدہ ہوں

تیغ نگاہِ چشم کا تیرے نہیں حریف
ظالم میں قطرۂ مژہ خوں چکیدہ ہوں

کس سے کروں میں دعویٰ دل جا کے اے خدا
دل دادۂ زکفِ رُخِ دلبر ندیدہ ہوں

کرتا ہے جا کے گل کی تسکیں چمن میں تو
خونِ جگر میں میں بھی تو دامن کشیدہ ہوں

غافل ہے کیوں نزار مری فرصت سے گوش دل
اے بے خبر میں نالۂ حلقِ بریدہ ہوں

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقولِ درد
"جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں"

○

سراؔج دکنی

خبرِ تحیرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا، نہ تو مَیں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا، مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی جامہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اِک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر اک شاخِ نہالِ غم جسے دِل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کِس زباں سے کروں بیاں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خُمِ دِل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتابِ عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر ہے یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دِلِ بے نوائے سراؔج کو
نہ خطر رہا، نہ عذر رہا، جو رہی سو بے خطری رہی

درد

تہمتیں چند اپنے ذمّے دھر چلے
کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر اُدھر چلے

دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو، اب ہم تو اپنے گھر چلے

آہ! بس جی مت جلا! تب جانیے
جب کوئی افسوں ترا اس پر چلے

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے، سنا ہے بھر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آگیا، جیدھر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اُسے لے کر چلے

جُوں شرر اے ہستیِ بے بود یاں!
بارے! ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ، کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے، کِدھر چلے؟

میر تقی میرؔ

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے — پنکھڑی اِک گُلاب کی سی ہے

چشم دل کھول اس ہی عالم پر — یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

○

عُمر بھر ہم رہے شرابی سے — دِل پر خوں کی اِک گلابی سے

جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ — رات گذرے گی کس خرابی سے

کھِلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

بُرقعہ اُٹھتے ہی چاند سا نِکلا — داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ — ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

○

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے!

یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے!

گور کس دِل جَلے کی ہے یہ فلک!
شُعلہ اِک صُبح یاں سے اُٹھتا ہے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا
کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے

نالہ سُر کھینچتا ہے جب میرا
شور اِک آسماں سے اُٹھتا ہے

سُدھ لے گھر کی بھی، شُعلۂ آواز
دُور کچھ آشیاں سے اُٹھتا ہے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو
جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے

یُوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

○

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماریٔ دِل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں مُوند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا قبلہ، کیسا کعبہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچہ کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم، ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہُوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

○

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں

ایک ایک فرطِ دَور میں یوں ہی مجھے بھی دو
جامِ شراب پُر نہ کرو، میں نشے میں ہوں

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو، میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جامِ مے
یا تھوڑی دُور ساتھ چلو، میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سرگراں تو نہ مجھ سے ہو، میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جُوں شیشہ میرے منہ نہ لگو، میں نشے میں ہوں

ناسخ لکھنوی

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے آبِ باراں میں
تصور رچا ہے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

دبا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماںؑ کا

وہ شوخ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے
کہ یک گوشہ ہے صحرائے قیامت اسکے داماں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ!
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

جرأت

بیٹھ آ وصل میں ٹک، لطف اٹھانے دے مجھے
اے نزے پاؤں پڑوں ہاتھ لگانے دے مجھے!

سرگزشت آتے ہی کیا پوچھے ہے اے جانِ جہاں
سب سناؤں گا تجھے آپ میں آنے دے مجھے!

اب تو دم رکنے لگا ضبطِ محبت سہتے سہتے
ایک دو اشک تو آنکھوں سے بہانے دے مجھے

مجھ سے پوچھے ہے بگڑ کر وہ حقیقت میری
کچھ تو اے بے خبری بات بنانے دے مجھے

ٹکٹکی باندھنے سے بات نہ کھل جائے کہیں
حیرتِ حسن پلک تک تو ہلانے دے مجھے

اور بھی وار لگاتے ہو سے کیا لگتا ہے
جو کہ زخموں پہ نہ مرہم بھی لگانے دے مجھے

انگلیاں پاؤں کی اب اپنے وہ دبوائے ہے
کچھ تو اے پاسِ ادب ہاتھ بڑھانے دے مجھے

غیر پاس اس کو نہ دوں بیٹھنے جی میں ولا
ضبط کر ضبط ورہِ ضبط بڑھانے دے مجھے

نہ رہا وہ بھی مزا ہائے خاک ہے وہ عدد
کہ نہ رنجش کا بھی کچھ لطف اٹھانے دے مجھے

اپنا منت سے بٹھانا وہ اور اس کا یہ کہنا
پھر نہیں آنے گا یاں بیں نہیں جانے دے مجھے

تو بھی پھر پوچھیو جرأت سببِ حیرانی
پہلے آئینہ ذرا اس کو دکھانے دے مجھے

انشاء اللہ خاں انشاؔ

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنّا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شئے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دَور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

آتش لکھنوی

یہ آرزو تھی، تجھے گُل کے روبرُو کرتے
ہم اور بُلبلِ بے تاب، گفت گو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا، تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

○

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغوان کیسے کیسے

بہار آئی ہے، نشّہ میں جھومتے ہیں
مُریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

نہ مُڑ کر بھی بے دَرد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناميوں کے نِشاں کیسے کیسے

غم و غصّہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
تری کلکِ قدرت کے قربان آنکھیں
دکھاتے ہیں خوش رُو جواں کیسے کیسے
کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لُوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

○

سُن تو سہی، جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟
زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر دیکھنا
قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دِل صاف ہو تیرا، تو ہے آئینہ خانہ کیا
صیّاد! اسیرِ دامِ رگِ گُل ہے عندلیب
دِکھلا رہا ہے چھُپ کے اسے دام و دانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے، نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

آتی ہے کس طرح سے میری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا اسیر
جب تیر کج پڑے گا، اُڑے گا نشانہ کیا

یوں مُدعی حسد سے نہ دے داد، تو نہ دے
آتشؔ غزل یہ تُو نے کہی عاشقانہ کیا

بہادر شاہ ظفرؔ

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تُو نے
کیوں خِرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لیے اگرچہ بنایا تھا مجھے!
کاش! خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

صُوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دُوریٔ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ مے خانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حُسن چمن میں نہ دکھایا اس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

○

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل! کبھی ایسی تو نہ تھی

تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عکسِ رُخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
تاب تجھ میں مہِ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تُو جو بگڑتا ہے ظفرؔ سے ہر بار
خُو تری حُور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

○

لگتا نہیں ہے دل میرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

کانٹوں کو مت نکال چمن سے او باغباں
یہ بھی گلوں کے ساتھ پلے ہیں بہار میں

بلبل سے کوئی شکوہ نہ صیّاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں

کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

○

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں، کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ترے رُخ کے خیال میں کون سے دن اُٹھا مجھ پہ نہ فتنۂ روز جزا
تری زلف کے دھیان میں کونسی شب مرے سر پہ ہجومِ بلا نہ رہا

ہمیں ساغر و بادہ کے دینے میں تُو کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا، جہاں میں سدا نہ رہا

کئی روز میں آج وہ ماہِ لقا، ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا، اسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آبِ رواں ہوئی جب کہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں، کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو رو خونِ جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر، کفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کئی لاکھ فریب، کروڑ فسوں، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا، نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ہو وہ کیسا صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

مومن خاں مومن

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظارہ نہیں، آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سُن اے موجِ ہوا، بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

منّتِ حضرت عیسٰیؑ نہ اُٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی، وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے وہی دشت و بیاباں ہوں گے
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

○

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج، راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا
نارسائی سے دم رکے تو رکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
رحم کر خصمِ جانِ عزیز نہ ہو — سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہے — دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

○

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب ہیں جو رُو برو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا بر ملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم، تو وفا جتانے کو دمبدم
گلۂ ملامتِ اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو! ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا آپ نے اک وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا!
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میر مہدی مجروحؔ

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

اِک عمر کے دُکھ پائے، سوتے ہیں فراغت سے
اے غلغلۂ محشر! ہم کو نہ جگا جانا

کیا یار کی بدخوئی، کیا غیر کی بدخواہی
سرمایۂ صد آفت ہے دل ہی کا آجانا

کچھ عرضِ تمنّا میں شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

وہ چلمن کا اُلٹ جانا، ظاہر کا بہانہ ہے
اُن کو تو بہر صورت اِک جلوہ دکھا جانا

ہے حق بطرف اس کے، چاہے سو ستم کر لے
اس نے دلِ عاشق کو مجبورِ وفا جانا

مجروحؔ ہوئے مائل کس آفتِ دوراں پر
اے حضرتِ من تم نے دل بھی نہ لگا جانا

نظامؔ رامپوری

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں
کیا منہ پہ اس نے رکھ لیے آنکھیں چرا کے ہاتھ

یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائیں غیر
اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ

بے اختیار ہو کے جو میں پاؤں پر گرا
ٹھوڑی کے نیچے اس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ

قاصد! ترے بیاں سے دل ایسا ٹھہر گیا
گویا کسی نے رکھ دیا سینے پہ آ کے ہاتھ

دیکھا جو کچھ رُکا مجھے، تو کس تپاک سے
گردن میں میری ڈال دیئے آپ آ کے ہاتھ

کوچہ سے تیرے اُٹھیں، تو پھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاں تو دونوں جہاں سے اُٹھا کے ہاتھ

دیتا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ
مُنہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

نسیم دہلوی

کب اس زمیں پہ مجھے آرمیدہ ہونا تھا
ہوا سے خاک کو برسوں پریدہ ہونا تھا

اگر تھی دامنِ جاناں کی آرزو اے دِل
تو چند دم کے لیے آب دیدہ ہونا تھا

کسی کے چہرہ پہ ہوتا کسی کے دامن میں
مجھے بھی آنکھ کا اشک چکیدہ ہونا تھا

کبھی نہ خدمتِ دامن سے سرفراز ہوا
وہ ہاتھ ہوں کہ جسے نارسیدہ ہونا تھا

کمالِ بے ادبی سے یہ عرض کرتے ہیں
ہمیں سے اے قدِ جاناں کشیدہ ہونا تھا

اگر تھی لذتِ پامال کی ہوس اے دِل
بہ شکل سبزہ زمیں پر دمیدہ ہونا تھا

عجب نہ تھا کہ اسے رحم کچھ نہ کچھ آتا
میری امید تجھے ابر دیدہ ہونا تھا

کمالِ ربط میں ہوتی ہیں سینکڑوں باتیں
نہ اس قدر تمہیں ہم سے کشیدہ ہونا تھا

ترا جمال بنا میں کبھی کبھی احساں
غرض یہ تھی کہ مجھے برگزیدہ ہونا تھا

کھلی اب آنکھ تو کیا فائدہ نسیمؔ افسوس
نہ سمجھے زیرِ لحد آرمیدہ ہونا تھا

مرزا غالب

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا، کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا؟

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دُوئی کی بُو بھی ہوتی، تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف! یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

○

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

○

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنّا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

○

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں!
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں!

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں!
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں!

○

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش! پوچھو کہ مُدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

ہاں! بھلا کر! ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب!
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

آپ بھی اتنا سمجھ لیں مجھ کو سمجھانے کے بعد
آدمی مجبور ہو جاتا ہے دل آنے کے بعد

شیفتہ

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں
جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

آ نغمہ گر ہو! چرخ میں لا آسمان کو
آ رقص کر! زمیں کو ڈال اضطراب میں

کا فروغ ہے واں جلوہ گاہ میں
سو باغ کی شمیم ہے واں رفتِ خواب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

سالک کو یہ مراد مجھ سا ہو نفس بھی
رہزن کو یہ خیال کہ رہرو ہو خواب میں

اس صوتِ جاں نواز کا ثانی بنا نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو بربط وعود و رباب میں

اے وائے! روزِ حشر اگر ہم سے ہو سوال
جو کچھ کیا ہے ہم نے شبِ ماہتاب میں

شرمِ گنہ، نہ بیمِ عقوبت، یہ رنج ہے
ہے ہے اُٹھائی اُس نے اذیت عذاب میں

لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی سے شیفتہ
ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

شعروں کی ڈکشنری

شعرستان

مختلف عنوانات کے تحت ہزاروں اشعار کا خوبصورت انتخاب

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیب رامپوری

آفتاب الدولہ قلق

ادا سے دیکھ تو جانا رہے گِلہ دِل کا
بس اِک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دِل کا

وُہ ظلم کرتے ہیں مجھ پر تو لوگ کہتے ہیں
خدا بُرے سے نہ ڈالے معاملہ دِل کا

پھرا جو کوچۂ قاتل سے کوئی پوچھیں گے
سُنا ہے لُٹ گیا رستے میں قافلہ دِل کا

ہزار فصلِ گُل آئے جنوں! وہ جوش کہاں
گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دِل کا

بہار آتے ہی کنجِ قفس نصیب ہوا
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دِل کا

الٰہی خیر ہو! کچھ آج رنگ بے ڈھب ہے
ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دِل کا

خدا کے ہاتھ ہے اب اپنا اے قلقؔ انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا مقابلہ دِل کا

آشفتہ

جامِ گدائی ہاتھ میں لے نت سانجھ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حُسن کے تیرے پھرتے ہیں

مدّت سے ہے اختر طالع ماہِ جبیں بن گردش میں
بھول تو یا ہمن بد بختی اپنی کب دن میرے پھرتے ہیں

پنڈت پوچھو، ہاتھ دکھاؤ، فال کھلاؤ کوئی، پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

عقل و خرد سلب ہوئے سب ہائے جنوں سے رُوائے رتنوں
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں

یوں کاندھے پہ زلفیں اسکی بل کھاتی ہیں وقتِ خرام
مارِ سیہ کو ڈالے گلے میں جیسے سپیرے پھرتے ہیں

جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک ان زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیرے پھرتے ہیں

امیر مینائی

یہ نہیں کیوں کر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے، میں ناز برداروں میں ہوں

جان پر صدمہ، جگر میں درد، دل کا حال تباہ
گھر کا گھر بیمار کس کس کے پرستاروں میں ہوں

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہ گاروں میں ہوں

جسم سے مطلب نہ گل سے کام کیا جانوں تمہیں
میں تمہارے سینہ چاکوں میں دلِ افگاروں میں ہوں

چھیڑ دیکھو میری میت پر جو آئے، یہ کہا
تم وفاداروں میں ہو، یا میں وفاداروں میں ہوں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس! میں نو گرفتاروں میں ہوں

بے گناہوں میں بھلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ، میں گنہ گاروں میں ہوں

بے گناہی کا تو دعویٰ ان کے آگے کیا مجال
ڈرتے ڈرتے منہ سے نکلا میں گنہگاروں میں ہوں

آچکا تھا رحم اس کو سن کے میری بے بسی
درد ظالم بول اُٹھا میں اس کے غم خواروں میں ہوں

○

جب سے بُلبل تُو نے دو تنکے لیے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لیے

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار
پھُول جنگل میں کھلے کن کے لیے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے

باغباں! کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کم سن کے لیے

سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند
اب کوئی حور آئے گی اُن کے لیے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیرؔ
بھیجتے تحفہ مؤذن کے لیے

نواب مرزا داغ

ساز، یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

کب کسی در کی جُبّہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں

پوچھئے مے کشوں سے لُطفِ شراب
یہ مزہ پاکباز کیا جانیں

حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں
لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے!
آپ بندہ نواز کیا جانیں

O

پھرے راہ سے وہ یہاں آ کے
اجل مر رہی تو کہاں آتے

مجھے یاد کرنے سے یہ مدّعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

کلیجہ مرے منہ کو آئے گا اِک دن
یوں ہی لب پہ آہ و فغاں آتے آتے

ابھی سِن ہی کیا ہے جو بے باکیاں ہوں
انہیں آئیں گی شوخیاں آتے آتے

چلے آتے ہیں دِل میں ارمان لاکھوں
مکاں بھر گیا مہماں آتے آتے

نتیجہ نہ نِکلا تھکے سب پیامی
وہاں جاتے جاتے یہاں آتے آتے

تمہارا ہی مشتاقِ دیدار ہو گا
گیا جان سے اِک جواں آتے آتے

یقیں ہے کہ ہو جائے آخر کو سچّی
مرے منہ میں تیری زباں آتے آتے

سُنانے کے قابل جو تھی بات اُن کو
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

تری آنکھ پھرتے ہی کیسا پھرا ہے
مری راہ پر آسماں آتے آتے!

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے

کسی نے کچھ ان کو اُبھارا تو ہوتا
نہ آتے نہ آتے یہاں آتے آتے

قیامت بھی آئی تھی ہمراہ اس کے
مگر رہ گئی ہم عناں آتے آتے

بنا ہے ہمیشہ یہ دل باغ و صحرا
بہار آتے آتے خزاں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

○

اس کی شرارتیں بھی قیامت سے کم نہیں
دل تجھ سے بڑھ کے ہے کسی صورت سے کم نہیں

اندوہ و درد و یاس و غم و رنج اپنے پاس
جو کچھ ہے وہ تمہاری عنایت سے کم نہیں

دنیا میں ان بتوں نے جلایا ہے اس قدر
دوزخ بھی میرے واسطے جنّت سے کم نہیں

وہ لذّتِ وصال سے لیتے ہیں جان و دل
یہ مہربانیاں بھی عداوت سے کم نہیں

اس کا ثواب لوٹنے والے ہمیں تو ہیں!
نظارہ میکدے کا عبادت سے کم نہیں

ہے شام ہی سے وصل میں تم کو تلاشِ صبح
یہ انتظار بھی مری حسرت سے کم نہیں

میں اپنے دل میں خوش ہوں یہ ہے بات ہی اور
شکرِ جفا وگرنہ شکایت سے کم نہیں

خونِ جگر کمی نہ کروں گا تمام عمر
جو رزق مل گیا مجھے قسمت سے کم نہیں

تُو نے دیا فروغ تو ہے داغ آفتاب
ذرہ بھی ورنہ اس کی حقیقت سے کم نہیں

بھری بہار میں، دامن دریدہ ہیں ہم لوگ
ہمیں نہ مار، غمِ بہار آفریدہ ہیں ہم لوگ

جلالؔ لکھنوی

وہ دِل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ مِلا
مِلا وہ غم کدہ، جس میں چراغ بھی نہ مِلا

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بُو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ مِلا

اسیر کر کے ہمیں، کیوں رہا کیا صیّاد
وہ ہم صفیر بھی چھُوٹے، وہ باغ بھی نہ مِلا

جُنوں کے عشق میں کیا ہونی ہے یادِ خدا
کہ دل بھی نہ تھا ٹھکانے، فراغ بھی نہ مِلا

دکھائیں یار کو کیا جسم داغدار کی سیر
نظر فریب ہمیں ایک داغ بھی نہ مِلا

پھر آئے محفلِ ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ مِلا

چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں
شبِ فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ مِلا

خبر کو یار کی بھیجا تھا، گم ہوئے ایسے
حواسِ رفتہ کا اب تک سراغ بھی نہ ملا

جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

کرامت علی شہیدی

جی چاہے گا جس کو، اسے چاہا نہ کریں گے
ہم عشق و ہوس کو کبھی یک جا نہ کریں گے

اے کاش! چھٹیں عہد شکن بن کے جہاں میں
باز آئے با وفا داری کا دعوٰے نہ کریں گے

گو حُسن پرستی نہ ہو خاطر سے فراموش
خوش قامتوں کا یاد سراپا نہ کریں گے

نرگس کی شب تیرہ میں لُوٹیں گے بہاریں
پر سُرمگیں آنکھوں کی تمنّا نہ کریں گے

بہلائیں گے سیرِ گل و شبنم سے دل اپنا
اس عارضِ گُل رنگ کی پروا نہ کریں گے

انگاروں پہ لوٹیں گے، پراُن شعلۂ رُخوں کے
نظارہ سے ہم آنکھ بھی سینکا نہ کریں گے

عِصمت کا انہیں خوف ہے تقویٰ کا ہمیں پاس
نَے کی ہے کبھی خواہشِ بے جا، نہ کریں گے

بکنے کے شہیدی کے بُرا مانیو مت جان
ہیں عاشقِ صادق کبھی ایسا نہ کریں گے

الطاف حسین حالیؔ

دُھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جُدائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خود نمائی کی

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی!

ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن
ہم سے باتیں کرو صفائی کی

دل رہا پائے بندِ الفت دام
تھی عبث آرزو رہائی کی

دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کِس سے
رکھئے اُمید دل رُبائی کی!

شہر و دریا سے باغ و صحرا سے
بُو نہیں آتی آشنائی کی!

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی!

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے!
ساعت آن پہنچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالیؔ
انتہا ہے بے حیائی کی!

○

کل مدعی کو آپ پر کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

یا کھینچ لائے دَیر سے رندوں کو اہلِ وعظ
یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے

وصلِ مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس
ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جاں رہے

کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رُو سیاہ
تم مُدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

شعروں کی ڈکشنری

شعرستان

مختلف عنوانات کے تحت ہزاروں اشعار کا خوبصورت انتخاب

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیب رامپوری

شاؔد عظیم آبادی

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو، وہ خواب ہیں ہم

اے درد، بتا کچھ تُو ہی بتا، اب تک یہ معمّہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں، یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبّت کہتا ہے، آ، کچھ بھی نہیں، پایاب ہیں ہم

ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں، پاس اپنے بلا لیں بہتر ہے
اب دردِ جُدائی سے ان کے اے آہ! بہت بیتاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ، قدر کرو، نایاب نہ ہوں، کمیاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاؔد یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

○

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا
تو میں مرنے سے درگزرا، مرے کس کام آئے گا

شبِ ہجراں کی سختی ہو تو ہو، لیکن یہ کیا کم ہے
کہ لب پر رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئے گا

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوبؑ، اے ساقی
خُم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا

یہاں دِل پر بنی ہے، تجھ سے اے غم خوار کیا اُلجھوں
یہ کون آرام ہے، مر جاؤں تب آرام آئے گا

گلی میں یار کی، اے شادؔ، سب مشتاق بیٹھے ہیں
خدا جانے وہاں سے حکم کس کے نام آئے گا

○

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اُسی کا ہے

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مکدر یا مصفا جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں
حقیقت میں وہی مے خوار ہے پینا اسی کا ہے

امیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد
جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینہ اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ لے اے شادؔ میری بیں
کہ جس کو منہ دکھاتا ہے یہ آئینہ اُسی کا ہے

○

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

نا تجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے، پوچھو تو کبھی پی ہے

اُس مَے سے نہیں مطلب دِل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مَے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مَے پی لے، ہوش ذرا سو جا
مہمانِ نظر اس دم اک برقِ تجلّی ہے

واں دل میں کہ صدمے دو، یاں جی میں کہ سب سہہ لو
ان کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

ہر ذرّہ چمکتا ہے، انوارِ الٰہی سے!
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

سُورج میں لگے دھبّہ، فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہم کو کہیں کافر، اللہ کی مرضی ہے

○

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا!
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بُلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دِل کو
سُنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دُوں گلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہوں آئیں تو احسان ہے ان کا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وُہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

———— ⁂ ————

ماہرؔ سے اجتناب نہ فرمائیں اہلِ دل
اچھّوں کے ساتھ ایک گنہگار بھی سہی

ریاض خیرآبادی

جس دِن سے حرام ہو گئی ہے
مَے ، خُلد مقام ہو گئی ہے

قابُو میں ہے ان کے وصل کا دِن
جب آئے ہیں شام ہو گئی ہے

آتے ہی قیامت اس گلی میں
پامالِ خرام ہو گئی ہے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

مَے نوش ضرور ہیں وہ نااہل
جن پر یہ حرام ہو گئی ہے

بُجھ بُجھ کے جلی تھی قبر پر شمع!
جل جل کے تمام ہو گئی ہے

ہر بات میں ہونٹ پر ہے دُشنام
اب حُسنِ کلام ہو گئی ہے
ہے دُور ابھی دریا ؔ منزل!
دِن ختم ہے شام ہو گئی ہے

حسرت موہانی

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

باہزاراں اضطراب و صدہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اُٹھنا اس جانب نگاہِ شوق سے
اور ترا غُرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا میرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

آ گیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رُلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ رازو نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بُلانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود رُوٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدّتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

باوجودِ ادّعائے اِتقا حسرتؔ مجھے!
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

O

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں!

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیّتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرتؔ ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

○

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جایئے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

میرے عُذرِ جرم پر مطلق نہ کیجئے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جایئے

راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جایئے

میری تحریرِ ندامت کا نہ کچھ دیجئے جواب
دیکھ لیجئے اور تغافل آشنا ہو جایئے

مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجئے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جایئے

ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جایئے

○

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

دل پہ جو بیتے سہہ لیتے ہیں، اپنی زباں میں کہہ لیتے ہیں
انشا جی ہم لوگ کہاں اور میر کا رنگِ کلام کہاں

ثاقبؔ لکھنوی!

ہجر کی شب نالۂ دِل وہ صدا دینے لگے
سُننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

کِس نظر سے آپ نے دیکھا دِل مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

جُنبشِ زیبِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جِس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبّت کا صلہ دینے لگے

آئینہ ہو جائے میرا عشق ان کے حُسن کا
کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقبؔ گھٹ رہا ہے وہ دھواں
اُف کروں تو آگ دُنیا کی ہوا دینے لگے

آرزو لکھنوی

ضبطِ غم دلِ آساں، اظہارِ وفا ممکن
ہونے کو یہ سب ممکن، ملنا ترا ناممکن

نالوں کا اثر ممکن تاثیرِ دعا ممکن
اس ہونے پہ ہر شے کے کچھ بھی نہ ہوا ممکن

اس عالمِ امکاں میں کیا ہے جو ہے ناممکن
ڈھونڈو تو ملے عنقا، چاہو تو خدا ممکن

جس کو تری خواہش ہے دنیا سے نہیں مطلب
اس کے لیے یکساں ہے ہر ممکن و ناممکن

بے جا بھی سہی شکوہ، غصہ نہیں کیوں آیا
میں بھی تو بشر ہی ہوں، انساں سے خطا ممکن

دو گز ہے زمیں کافی، بستی ہو کہ ویرانہ
پڑ رہنے کو جا آساں مر مٹنے کو جا ممکن

مرنا وہی چاہے گا جینا جسے مشکل ہو
پھر زہر ہی کیوں کھاتے، ہوتی جو دوا ممکن

اے آرزو اب میں ہوں اور عشق کی رسوائی
خاموش بھی گر بیٹھوں چرچا نہ ہو کیا ممکن

اقبالؔ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا، کہ چھپا ہوا ہو، سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اُسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے، نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طواف، کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی!
مرے جُرم خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملیگا نماز میں

○

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبالؔ تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

○

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت! وہ نگہ کا تازیانہ

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آذرانہ!

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے! نہ قفس نہ آشیانہ

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

مرے خاک و خوں سے تُو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

○

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم!
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

○

نہ تو زمیں کے لیے ہے، نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبّت کے
یہ خار و خس کے لیے ہے، یہ نیستاں کے لیے

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن!
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بے کراں کے لیے

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے

نِگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اُسے
بڑھا دیا ہے، فقط زیبِ داستاں کے لیے

مرے گلو میں ہے اِک نغمۂ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لیے

شعروں کی ڈکشنری

شعرستان

مختلف عنوانات کے تحت ہزاروں اشعار کا خوبصورت انتخاب

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیب رامپوری

حفیظ جونپوری

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے

دن کو اک نور برستا ہے مری تربت پر
رات کو چادرِ مہتاب تنی ہوتی ہے

لُٹ گیا وہ ترے کوچے میں رکھا جس نے قدم
اس طرح کی بھی کہیں راہزنی ہوتی ہے

ہجر میں زہر ہے ساغر کا لگانا منہ سے!
مے کی جو بوند ہے، ہیرے کی کنی ہوتی ہے

میکشوں کو نہ کبھی فکرِ کم و بیش ہوئی
ایسے لوگوں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے

ہُوک اُٹھتی ہے اگر ضبطِ فغاں کرتا ہوں
سانس رُکتی ہے تو برچھی کی اَنی ہوتی ہے

پی لی دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظؔ
صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

فانی بدایونی

قسم نہ کھاؤ تغافل سے باز آنے کی
کہ دِل میں اب نہیں طاقت ستائے جانے کی

ہماری موت نے کچھ مختصر کیا، ورنہ
کچھ اِنتہا ہی نہ تھی، عِشق کے فسانے کی

گری نہ برق، کچھ اس خوف سے مرے ہوتے
تڑپ کے آگ بجُھا دوں، نہ آشیانے کی

تمہارا درد تو درماں بنا لیا ہم نے
اب اور سوچیئے تدبیر، دل دُکھانے کی

زمانہ کفرِ محبّت سے کر چکا تھا گریز
تیری نظر نے پلٹ دی ہوا زمانے کی

پلٹ پلٹ کے قفس ہی کی سمت جاتا ہوں
کِسی نے راہ بتائی نہ آشیانے کی

نجات دی غمِ دنیا نے دردِ دِل نے مجھے
یہ ایک راہ ملی، غم سے چھوٹ جانے کی

بنا رہا ہے ہر انداز خاکِ فانی کا
یہ خاک ہے اس کافر کے آستانے کی

○

دُنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں، ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے

عجز، گناہ کے دم تک ہیں، عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے، رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشتِ دل سے پھرنا ہے، اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں، یہ تو ہوش پرستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھُلتی ہے نہ برستی ہے

جگ سُوتا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دُنیا بستی ہے

دِل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں، ظالم!
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانیؔ جس میں آنسو کیا، دل کے لہو کا کال نہ تھا!
ہائے! وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

○

اِک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

خلق کہتی ہے جسے، دِل ترے دیوانے کا
اِک گوشہ ہے یہ دُنیا، اسی ویرانے کا

مختصر قِصّۂ غم یہ ہے، کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین، خلاصہ ہے اس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیمان ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نا تماشہ میرے غم خانے کا

دِل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

حُسن ہے ذات مِری عِشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع، مگر بھیس ہے پروانے کا

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

ہر نفس، عمرِ گزشتہ کی ہے میّت فانیؔ!
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

اصغر گونڈوی

ترے جلوؤں کے آگے ہمتِ شرحِ و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

مٹی جاتی تھی بلبل، جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا؟ اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل، معاذ اللہ
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

○

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب رُوئے تاباں پر پڑے، بیکار ہو جائے

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خم دار ہو جائے

سحر لائے گی کیا پیغام بیداری شبستاں میں؟
نقابِ رُخ اُلٹ دو، خود سحر بیدار ہو جائے

یہ اقرارِ خودی ہے، دعوٰیِ ایمان و دیں کیسا؟
ترا اقرار جب ہے، خود سے بھی انکار ہو جائے

نظر اس حُسن پر ٹھہرے، تو آخر کس طرح ٹھہرے؟
کبھی خود پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

برج نرائن چکبست

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیّت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انھی اجزا کا پریشاں ہونا

ہم کو منظور ہے اے دیدۂ وحدت آگیں
ایک غنچہ میں تماشائے گلستاں ہونا

جس طرح کسی خم سے جام کا ٹکڑا نکلے!
یونہی گردوں سے مہِ نو کا نمایاں ہونا

سر میں سودا نہ رہا پاؤں میں بیڑی نہ رہی
میری تقدیر میں تھا بے سروساماں ہونا

صفحۂ دہر میں مہر یدِ قدرت سمجھو!
پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

ہو بیاضِ سحرِ نور پہ دِل کیا مائل!
یاد ہے دفترِ انجم کا پریشاں ہونا

کل بھی وہ کل جو ہے فردائے قیامت زاہد
اور پھر اس کے لیے آج پریشاں ہونا

پاؤں زنجیر کے مشتاق ہیں اے جوشِ جنوں
ہے مگر شرط ترا سلسلہ جنباں ہونا

گُل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستارِ غریباں ہونا

ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لیے چاکِ گریباں ہونا

محفلِ دوست نہیں، رہگزرِ دوست نہیں
بیٹھ جانے دے مجھے گردشِ ایام کہیں

نوحؔ ناروی

آپ جن کے قریب ہوتے ہیں
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

جب طبیعت کسی پہ آتی ہے
موت کے دن قریب ہوتے ہیں

مجھ سے مِلنا، پھر آپ کا مِلنا
آپ کس کو نصیب ہوتے ہیں

ظلم سہہ کر جو اُف نہیں کرتے
اُن کے دِل بھی عجیب ہوتے ہیں

عشق میں اور کچھ نہیں مِلتا!
سینکڑوں غم نصیب ہوتے ہیں

نوحؔ کی قدر کوئی کیا جانے
کہیں ایسے ادیب ہوتے ہیں

مرزا یاس یگانہ چنگیزی

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سُنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو، وہی کل، آج، بن کے آ نہ گیا

گناہِ زندہ دِلی کہیئے یا دِل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سُنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

پکارتا رہا کِس کِس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

کروں تو کس سے دردِ نارسا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

○

مجھے دِل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا
ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر
مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا
مجھے اے خدا آخر کس کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا
اسیرِ وشوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا
سراپا راز ہوں، میں کیا بتاؤں، کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

عبدالمجید سالک

جو خشتِ خاک ہو، اس خاکداں کی بات کرو
زمیں پہ رہ کے نہ تم آسماں کی بات کرو

کسی کی تابشِ رخسار کا کہو قصّہ!
کسی کے گیسوئے عنبر نشاں کی بات کرو

نہیں ہوا جو طلوعِ آفتاب تو فی الحال!
قمر کا ذکر کرو، کہکشاں کی بات کرو

رہے گا مشغلہ یادِ رفتگاں کب تک
گزر رہا ہے جو اس کارواں کی بات کرو

یہی جہاں ہے ہنگامہ زارِ سُود و زیاں!
یہیں کے سُود، یہیں کے زیاں کی بات کرو

اب اس چمن میں نہ صیّاد ہے نہ ہے گلچیں
کرو تو اب ستمِ باغباں کی بات کرو

اثر لکھنوی

وہ آنکھ، وہ تیور، وہ مدارات نہیں ہے
کس طرح کوئی مان لے، کچھ بات نہیں ہے

ملنے کا یہ انداز نیا تم نے نکالا
گویا کبھی پہلے کی ملاقات نہیں ہے

جو آپ کہیں اس میں یہ پہلو ہے، وہ پہلو ہے
اور ہم جو کہیں بات میں وہ بات نہیں ہے

کہنے کو یہاں رندِ خرابات نہیں ہے
دل گرمیِ رندانِ خرابات نہیں ہے

آ جائے گا سو بار اثرؔ منہ کو کلیجا!
باتوں میں جو کٹ جائے یہ وہ رات نہیں ہے

○

حیا میں اک ادا نکلی، اداؤں سے حجاب آیا
شباب آیا اور اس انداز سے ان کا شباب آیا

جوانی اور آئینہ، تبسّم اور انگڑائی
حیا بے اختیار آئی، اداؤں پر عتاب آیا

وہی آنکھیں کہ جن سے بادۂ گلگوں چھلکتا تھا
وہی نرگس کی کلیاں تھیں جہاں ہنگامِ خواب آیا

بگڑنا، رُوٹھنا، باتیں بنانا مجھ سے آتی ہیں
مگر اے دل نہ کوئی ان کے طعنوں کا جواب آیا؟

نظر اُٹھی نظر کے سامنے اِک موجِ شراب اٹھی
مجسّم کیفِ رنگیں بن کے وہ مستِ شباب آیا

گلوں کی گود میں جیسے نسیم آکر مچل جائے
اسی انداز سے ان پُر خمار آنکھوں میں خواب آیا

بسا پھولوں کی نکہت میں لیے مستی شرابوں کی
مہکتا، لہلہاتا ایک کافر کا شباب آیا

نہ دینا دادِ شوخی کی خطا تھی، اب یہ تہمت ہے
نگاہیں اُٹھ گئیں کیوں جب ادھر وہ بے نقاب آیا

اخترؔ کو ہوش میں پاؤ تو کہہ دو کوئی کہتا تھا،
کہاں ہے، کیا ہوا، جا کر نہ وہ خانہ خراب آیا

جگر مراد آبادی

یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ
مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا ہے
میرے دل سے کہہ گئی کیا؟ وہ نگاہِ ناقدانہ
مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے! کوئی چاہیئے بہانہ
ہیں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں، جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ
مرے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا؟
مجھے اے جگر مبارک! یہ شکستِ فاتحانہ

O

دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد
ہیں شکوہ بہ لب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد
شاید کہ میرے بھولنے والے نے کیا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے
اب تک ہے وہ اک نغمۂ بے سازو صدا یاد

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
مرنے کی ادا یاد، نہ جینے کی ادا یاد

مدت ہوئی اِک حادثۂ عشق کو، لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

ہاں ہاں تجھے کیا کام مری شدّتِ غم سے
ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد

میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

کیا لطف، کہ میں اپنا پتا آپ بتاؤں
کیجئے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

صوفی تبسّم

سو بار چمن مہکا ، سو بار بہار آئی
دُنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

اک لحظہ بہے آنسو اِک لحظہ ہنسی آئی
سیکھے ہیں نئے دل نے اندازِ شکیبائی

جلوؤں کے تمنّائی جلوؤں کو ترستے ہیں
تسکین کو روئیں گے جلوؤں کے تمنّائی

دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبّت کے
آغاز بھی رُسوائی ، انجام بھی رسوائی

دنیا ہی فقط میری حالت پہ نہیں چونکی
کچھ تیری بھی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی

یہ بزم محبّت ہے، اس بزمِ محبّت میں
دیوانے بھی شیدائی فرزانے بھی شیدائی

○

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو

ایسا نہ ہو، یہ دَرد بنے دردِ لا دوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

شاید تمہیں بھی چین نہ آئے میرے بغیر
شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو

کیا جانے، پھر ستم بھی میسّر ہو یا نہ ہو
کیا جانے، یہ کرم بھی کرو یا نہ کر سکو

اللہ کرے جہاں کو میری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو
میرے سوا کسی کی تمنّا نہ کر سکو

جھلملاتا سا چراغِ رہِ امّید ہوں میں
وقت بھولے سے مجھے چھوڑ گیا ہو جیسے

حفیظ جالندھری

ہم ہی ہیں بھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمھیں بھلا سکے

تم ہی اگر نہ سن سکے قصۂ غم، سنے گا کون؟
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آچکے تھے ہم، جوش میں آچکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں
دِل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے

شوقِ وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کِس کی مجال ہے یہاں ہم سے نظر ملا سکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر بات پہ کان دھر سکے
سُن کے یقین کر سکے، جا کے انہیں سنا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمی مزاج دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست جسکی سمجھ میں آسکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تیری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

فراقؔ گورکھپوری

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے
اِک شرحِ حیات ہو گئی ہے
مدّت سے خبر ملی نہ دِل کی
شاید کوئی بات ہو گئی ہے
جس شے پہ نظر پڑی ہے میری
تصویرِ حیات ہو گئی ہے!
کیا جانیے، موت پہلے کیا تھی!
اب میری حیات ہو گئی ہے
اس دَور میں زندگی بشر کی!
بیمار کی رات ہو گئی ہے
مٹنے لگیں زندگی کی قدریں
جب غم سے نجات ہو گئی ہے
اِکّا دُکّا صدائے زنجیر
زنداں میں رات ہو گئی ہے
ایک ایک صفت فراقؔ اس کی
دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے!

○

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنّا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

تم نے پوچھا بھی نہیں ہم نے بتایا بھی نہیں
کونسا راز وہ ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں

یہ بھی سچ ہے کہ محبت پہ نہیں میں مجبور
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں

بدگمان ہو کے مل اے دوست جو ملنا ہے مجھے
بے جھجکتے ہوئے ملنا کوئی ملنا بھی نہیں

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں!
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

تجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنے حجابِ بیباک
میں اُٹھا، تا حدِ آداب تماشا بھی نہیں

ہائے وہ رازِ محبت جو چھپائے نہ بنے
ہائے وہ داغِ محبت جو اُبھرتا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

شکوۂ جور کرے کیا کوئی اس شوخ سے، جو
صاف قائل بھی نہیں صاف مکرتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تیری رنجشِ بے جا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام
کنجِ زنداں بھی نہیں وسعتِ صحرا بھی نہیں

آہ یہ مجمعِ احباب، یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقِ سخن آرا بھی نہیں

○

شامِ غم کچھ اُس نگاہِ ناز کی باتیں کریں
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کریں

یہ سکوتِ ناز، یہ دِل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کریں

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کریں

ہر رگِ دِل وجد میں آتی رہے دُکھتی رہے
یونہی اس کے جا و بے جا ناز کی باتیں کریں

جو عدم کی جان ہے جو ہے پیامِ زندگی
اُس سکوتِ راز، اُسی آواز کی باتیں کریں

عشقِ رُسوا ہو چلا بے کیف سا بے زار سا
آج اس کی نرگسِ غماز کی باتیں کریں!

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کریں

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراقؔ
آج اس عیسیٰ نفس دم ساز کی باتیں کریں

وہ دل کی آیتوں میں تھا وہ مصحف جبیں پہ تھا
فلک پہ ڈھونڈتی تھی میں مرا خدا زمیں پہ تھا

چراغ حسن حسرت

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے، وہ دستِ دُعا ہوتا

اِک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا، یا دل نہ دیا ہوتا!

ناکامِ تمنّا دِل، اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا، یوں ہوتا تو کیا ہوتا

اُمید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سُنا ہوتا

اختر شیرانی

کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ؟
زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ

آہ یہ زلف ہے یا ابرِ سیہ مے خانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جامِ شراب آلودہ

کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ

کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ

کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے یا یں لطف، عتاب آلودہ

پھر ہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو
پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ

حسرتِ بوسہ پہ اختر یہ خیال آتا ہے
کیوں مرے لب سے ہوں وہ برگِ گلاب آلودہ

○

○

میں آرزوئے جاں لکھوں، یا جانِ آرزو!
تُو ہی بتا دے ناز سے ایمانِ آرزو

آنسو نکل رہے ہیں تصوّر میں بن کے پھُول
شاداب ہو رہا ہے گلستانِ آرزو

ایمان و جاں نثار تری اِک نگاہ پر
تو جانِ آرزو ہے تو ایمانِ آرزو

ہونے کو ہے طلوع، صباحِ شبِ وصال
بجھنے کو ہے چراغِ شبستانِ آرزو

اِک وہ کہ آرزوؤں پہ جیتے ہیں عمر بھر
اِک ہم کہ ہیں ابھی سے پشیمانِ آرزو

آنکھوں سے جوئے خوں ہے رواں دل ہے داغ داغ
دیکھے کوئی بہارِ گلستانِ آرزو

دل میں نشاطِ رفتہ کی دھندلی سی یاد ہے!
یا شمعِ وصل ہے تہِ دامانِ آرزو

اختر کو زندگی کا بھروسہ نہیں رہا
جب سے لٹا چکے سر و سامانِ آرزو

محمد دین تاثیر

حُسن کے رازِ نہاں شرحِ بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دِل میں گئے، دل سے زباں تک پہنچے

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے دل سے کہدی
بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقیں سے واصل
اِنتہا عقل کی یہ ہے کہ گماں تک پہنچے

کعبہ و دیر میں تو لوگ ہیں آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

آنکھ سے آنکھ کہے، دل سے ہوں دل کی باتیں
وائے وہ عرضِ تمنّا جو زباں تک پہنچے!

اسرار الحق مجاز

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زُلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کہیئے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے!

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے!
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہیئے!
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

○

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیئے، بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں، ہم رازِ تبسّم پا بھی گئے

رُودادِ غمِ الفت اُن سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے!
ایک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پہ فرقت میں اب کیا کہیئے کیا کیا گزری!
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں!
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

غم کی تند و تیز آندھی سب اُڑا کر لے گئی
جب فراہم کچھ سکوں کا میں نے شیرازہ کیا

فیض احمد فیضؔ

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش ، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا!
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ، تنِ داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن ، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

اِدھر ایک حرف کہ کشتنی ، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اڑا دیا ، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار! ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

○

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

○

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دوعالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں، جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

○

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی، وُہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھُولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

○

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دِل پہ خرابی ہزار گزری ہے
ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے
وُہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وُہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے
نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے
چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

تم رہے پیشِ نظر صحنِ چمن میں جب تک
اپنی افسردہ مزاجی پہ نظر تک نہ گئی

عبدالحمید عدمؔ

منقلب صورتِ حالات بھی ہو جاتی ہے
دن بھلے ہوں تو کرامات بھی ہو جاتی ہے

حُسن کو آتا ہے جب اپنی ضرورت کا خیال
عشق پر لطف کی برسات بھی ہو جاتی ہے

دَیر و کعبہ ہی سے اس کا نہ تعلق سمجھو!
زندگی ہے یہ خرابات بھی ہو جاتی ہے

جبر سے طاعتِ یزداں بھی ہے بارِ خاطر
پیار سے عادتِ خدمات بھی ہو جاتی ہے

داورِ حشر! مجھے اپنا مصاحب نہ سمجھ
بعض اوقات کھری بات بھی ہو جاتی ہے

حشر میں لے کے چلو مطرب و معشوق و سبُو!
غیر کے گھر میں کبھی رات بھی ہو جاتی ہے

بعض اوقات کسی اور کے ملنے سے عدمؔ!
اپنی ہستی سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے

احسان دانش

نہ سبو ہونٹ نہ خوابوں میں صدا دو ہم کو
مصلحت کا یہ تقاضا ہے بھُلا دو ہم کو

جرمِ سقراط سے ہٹ کر نہ سزا دو ہم کو
زہر رکھا ہے تو یہ آبِ بقا دو ہم کو

بستیاں آگ میں بہ جائیں کہ پتھّر برسیں
ہم اگر سوئے ہوئے ہیں تو جگا دو ہم کو

ہم حقیقت ہیں تو تسلیم نہ کرنے کا سبب؟
ہاں اگر حرفِ غلط ہیں تو مِٹا دو ہم کو

خضر مشہور ہو الیاس بنے پھرتے ہو
کب سے ہم گم ہیں، ہمارا تو پتا دو ہم کو

زیست ہے اس سحر و شام سے بیزار و زبوں
لالہ و گل کی طرح رنگِ قبا دو ہم کو!

شورشِ عشق میں ہے حسن برابر کا شریک
سوچ کر جرمِ تمنّا کی سزا دو ہم کو

جرأتِ لمس بھی امکانِ طلب میں ہے مگر
یہ نہ ہو اور گنہ گار بنا دو ہم کو

کیوں نہ اس شب سے نئے دور کا آغاز کریں
بزمِ خوباں سے کوئی نغمہ سرا دو ہم کو

مقصدِ زیست غمِ عشق ہے، صحرا ہو کہ شہر
بیٹھ جائیں گے، جہاں چاہو بٹھا دو ہم کو

ہم چٹانیں ہیں کوئی ریت کے ساحل تو نہیں
شوق سے شہر پناہوں میں لگا دو ہم کو

بھیڑ بازارِ سماعت میں ہے نغموں کی بہت
جس سے تم سامنے ابھرو، وہ صدا دو ہم کو

کون دیتا ہے محبت کو پرستش کا مقام
تم یہ انصاف سے سوچو تو دعا دو ہم کو

آج ماحول کو آرائشِ جاں سے ہے گریز
کوئی دانش کی غزل لا کے سنا دو ہم کو

○

وفا کا عہد تھا دل کو سنبھالنے کے لیے
وہ ہنس پڑے مجھے مشکل میں ڈالنے کے لیے

بندھا ہوا ہے بہاروں کا اب وہیں تانتا
جہاں رکا تھا میں کانٹے نکالنے کے لیے

کوئی تبسم کا نغمہ، کوئی تبسم کا راگ!
فضا کو امن کے قالب میں ڈھالنے کے لیے

خدا نکردہ ، زمیں پاؤں سے اگر کھسکی!
بڑھیں گے تُند بگولے سنبھالنے کے لیے

اتر پڑے ہیں کدھر سے یہ آندھیوں کے جلوس
سمندروں سے جزیرے نکالنے کے لیے

ترے سلیقۂ ترتیبِ نَو کا کیا کہنا
ہمیں تھے قریۂ دل سے نکالنے کے لیے

کبھی ہماری ضرورت پڑے گی دنیا کو!
دلوں کی برف کو شعلوں میں ڈھالنے کے لیے

یہ شعبدے ہی سہی کچھ فسوں گروں کو بلاؤ
نئی فضا میں ستارے اچھالنے کے لیے

ہے صرف ہم کو ترے خال و خد کا اندازہ
یہ آئنے تو ہیں حیرت میں ڈالنے کے لیے

نہ جانے کتنی مسافت سے آئے گا سورج
نگارِ شب کا جنازہ نکالنے کے لیے

میں پیش رو ہوں، اسی خاک سے اُگیں گے چراغ
نگاہ و دل کے اُفق کو اُجالنے کے لیے

فصیلِ شب سے کوئی ہاتھ بڑھنے والا ہے
فضا کی جیب سے سورج نکالنے کے لیے

کنوئیں میں پھینک کے پچھتا رہا ہوں اے دانشؔ
کمند جو تھی مناروں پہ ڈالنے کے لیے

O

کل رات کچھ عجیب سماں غم کدے میں تھا
میں جس کو ڈھونڈتا تھا مرے آئینے میں تھا

جس کی نگاہ میں تھیں ستاروں کی منزلیں
وہ میر کائنات اسی قافلے میں تھا

رہ گیر سُن رہے تھے یہ کس جشنِ نو کا شور
کل رات میرا ذکر یہ کس سلسلے میں تھا

رقصاں تھے رند، جیسے بھنور میں شفق کے پھول
جو پاؤں پڑ رہا تھا بڑے قاعدے میں تھا

چھڑکا جسے عدم کے سمندر پہ آپ نے
صحرا تمام خاک کے اس بلبلے میں تھا!

منت گزار اہلِ ہوس، ہو سکا نہ دِل!
حائل میرا ضمیر میرے راستے میں تھا

ہے فرض اس عطائے جنوں کا بھی شکریہ
لیکن یہ بے شمار کرم کس صلے میں تھا

اب آ کے کہہ رہے ہو کہ رسوائی سے ڈرو
یہ بال تو کبھی کا میرے آئینہ میں تھا

سُنتا ہوں سرنگوں تھے فرشتے میرے حضور
میں جانے اپنی ذات کے کس مرحلے میں تھا

ہیں ثبت میرے دِل پہ زمانے کی ٹھوکریں
میں ایک سنگِ راہ تھا جس راستے میں تھا

کچھ بھی نہ تھا ازل میں بجز شعلۂ وجود
ہاں دُور تک عدم کا دھواں حاشیے میں تھا

میں نے جو اپنا نام پکارا تو ہنس پڑا
یہ مجھ سا کون شخص مرے راستے میں تھا

تھی نقطۂ نگاہ تک آزادیٔ عمل
پُرکار کی طرح میں رواں دائرے میں تھا

زنجیر کی صدا تھی نہ موجِ شمیمِ زُلف!
یہ کیا طلسم اُن کے میرے فاصلے میں تھا

اب روح اعترافِ بدن سے ہے منحرف
اِک یہ بھی سنگِ میل میرے راستے میں تھا

دانش کئی نشیب نظر سے گزر گئے
ہر رِند آئینے کی طرح مے کدے میں تھا

معین احسن جذبی

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنّا کون کرے
یہ دُنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دُنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنّا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے، اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے
دُنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی، ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دُنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دُنیا دُنیا کون کرے

○

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں، آہوں میں اشارہ کرتے ہیں
کیا تجھ کو پتا، کیا تجھ کو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی! ہم تجھ کو کس طرح سنوارا کرتے ہیں
اے موجِ بلا! اِن کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

کیا جانیئے کب یہ پاپ کٹے، کیا جانیئے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

شعروں کی ڈکشنری

شعرستان

مختلف عنوانات کے تحت ہزاروں اشعار کا خوبصورت انتخاب

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیب رامپوری

سیّد عابد علی عابدؔ

واعظِ شہر خدا ہے، مجھے معلوم نہ تھا
یہی بندے کی خطا ہے مجھے معلوم نہ تھا

غمِ دوراں کا جو مداوا نہ ہوا پر نہ ہوا
ہاتھ میں کس کے شفا ہے مجھے معلوم نہ تھا

نغمۂ نَے بھی نہ ہو بانگِ بطِ مے بھی نہ ہو
یہ بھی جینے کی ادا ہے مجھے معلوم نہ تھا

میں سمجھتا تھا جسے ہیکل و محراب و کنشت
میرا نقشِ کفِ پا ہے مجھے معلوم نہ تھا

اپنے ہی ساز کی آواز پہ حیراں تھا میں
زخمۂ ساز نیا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

جس کی ایماء پہ کیا شیخ نے بندوں کو ہلاک
وہی بندوں کا خدا ہے مجھے معلوم نہ تھا

خطبۂ ترغیبِ ہلاکت کا روا ہے اے دوست
شعر کہنے کی سزا ہے مجھے معلوم نہ تھا!

شبِ ہجراں کی درازی سے پریشاں نہ تھا
یہ تری زلفِ رسا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

وُہ مجھے مشورۂ ترکِ وفا دیتے تھے
یہ محبّت کی ادا ہے مجھے معلوم نہ تھا

چہرہ کھولے نظر آتی تھی عروسِ گلنار
منہ پہ شبنم کی رِدا ہے مجھے معلوم نہ تھا

کفر و ایماں کی حدیں کس نے تعیّن کی تھیں
اس پہ ہنگامہ بپا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

یہی مارِ دو زباں میرا لہُو چاٹ گیا
رہنما ایک بلا ہے مجھے معلوم نہ تھا

عجب انداز سے تھا کوئی غزل خواں کل رات
عابدِؔ شعلہ نوا ہے، مجھے معلوم نہ تھا

○

چین پڑتا ہے دِل کو آج نہ کل
وہی اُلجھن گھڑی گھڑی پل پل!

میرا جینا ہے سیج کانٹوں کی
ان کے مرنے کا نام تاج محل

کیا سُہانی گھٹا ہے ساون کی
سانوری نار، مدھ بھری چنچل

نہ ہُوا رفع میرے دل کا غبار
کیسے کیسے برس گئے بادل!

پیار کی راگنی انوکھی ہے!
اس میں لگتی ہیں سب سُریں کومل

رین پیئے انکھڑیاں نشیلی ہیں
نین کالے ہیں تیرے بن کاجل

مجھے دھوکا ہوا کہ جادو ہے
پاؤں بجتے ہیں تیرے بن چھاگل

لاکھ آندھی چلے خیاباں میں
مسکراتے ہیں طاقچوں میں کنول

لاکھ بجلی گرے گلستاں میں
لہلہاتی ہے شاخ میں کونپل

کھل رہا ہے گلاب ڈالی پر
جل رہی ہے بہار کی مشعل

کوہکن سے مفر نہیں کوئی
بے ستوں ہوں کہیں کہ بندھیاچل

ایک دن پتھروں کے بوجھ تلے
خود بخود گر پڑیں گے راج محل

دمِ رخصت وہ چپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

حفیظ ہوشیارپوری

نہ پوچھ، کیوں مری آنکھوں میں آ گئے آنسو
جو تیرے دل میں ہے، اس بات پر نہیں آئے

وفائے عہد ہے یہ، یا شکستگی تو نہیں
ٹھہر گیا کہ مرے ہم سفر نہیں آئے

نہ چھیڑ ان کو خدا کے لیے کہ اہلِ وفا
بھٹک گئے ہیں تو پھر راہ پر نہیں آئے

ابھی ابھی وہ گئے ہیں مگر یہ عالم ہے
بہت دنوں سے جیسے وہ نظر نہیں آئے

کہیں یہ ترکِ محبت کی ابتدا تو نہیں!
وہ مجھ کو یاد کبھی اس قدر نہیں آئے

عجیب منزلِ دلکش عدم کی منزل ہے
مسافرانِ عدم لوٹ کر نہیں آئے

حفیظ کب انہیں دیکھا نہیں برنگِ دگر
حفیظ کب وہ برنگِ دگر نہیں آئے

○

محبّت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریکِ گریۂ شبنم نہ ہوں گے

ذرا دیر آشنا چشمِ کرم ہے
ستم ہی عشق میں پیہم نہ ہوں گے

دلوں کی اُلجھنیں بڑھتی رہیں گی!
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

زمانے بھر کے غم یا اِک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے

کہوں بے درد کیوں اہلِ جہاں کو
وہ میرے حال سے محرم نہ ہوں گے

ہمارے دل میں سیلِ گریہ ہوگا
اگر بادیدۂ پُرنم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

حفیظؔ ان سے میں جتنا بد گماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

قیوم نظر

تیری نگہ سے، تجھ کو خبر ہے، کہ کیا ہوا
دِل زندگی سے بارِ دگر، آشنا ہوا

اک اک قدم پہ اس کے ہُوا سجدہ ریز میں
گزرا تھا جس جہاں کو کبھی روندتا ہوا

دیکھا تجھے تو آرزؤں کا ہجوم تھا
پایا تجھے تو کچھ نہ تھا باقی رہا ہوا

دشتِ جنوں میں ریگ رواں سے خبر ملی
پھرتا رہا ہے تو بھی مجھے ڈھونڈتا ہوا

احساسِ نَو نے زیست کا نقشہ بدل دیا
محرومیوں کا یوں تو چمن ہے کھُلا ہوا

چمکا ہے بن کے سروِ چراغاں تمام عمر
کیا آنسوؤں کا تار تھا تجھ سے بندھا ہوا

بکھرے ہیں زندگی کے کچھ اسطرح تار و پود
ہر ذرّہ اپنے آپ میں محشر نما ہوا

پوچھو تو ایک ایک ہے تنہا سلگ رہا
دیکھو تو شہر شہر ہے میلہ لگا ہوا

پردہ اٹھا سکو تو جگر تک گداز ہے
چاہو کہ خود ہو یوں تو ہے پتھر پڑا ہوا
انسان دوستی کے تقاضوں کا سلسلہ
انسان دشمنی کی حدوں سے ملا ہوا
اقدار کے فریب میں اب آ چکا نظرؔ
کشتی ڈبو گیا جو خدا، نا خدا ہوا

—————✣—————

یوسف ظفرؔ

ہم گرچہ دل و جان سے بیزار ہوئے ہیں
خوش ہیں کہ تیرے غم کے سزاوار ہوئے ہیں

اُٹھے ہیں تیرے در سے اگر صورتِ دیوار
رخصت بھی تو جوں سایۂ دیوار ہوئے ہیں

کیا کہیئے، نظر آتی ہے کیوں خواب یہ دُنیا
کیا جانیئے کس خواب سے بیدار ہوئے ہیں

آنکھوں میں تیرے جلوے لیے پھرتے ہیں ہم لوگ
ہم لوگ کہ رُسوا سرِ بازار ہوئے ہیں

کچھ دیکھ کے پیتے ہیں لہُو اہلِ تمنّا
مے خوار کسی بات پہ مے خوار ہوئے ہیں

زنجیرِ حوادث کی ہے جھنکار بہر گام
کیا جرم کیا تھا کہ گرفتار ہوئے ہیں

اظہارِ غمِ زیست کریں کیا کہ ظفرؔ ہم
وُہ غم ہیں کہ شرمندۂ اظہار ہوئے ہیں

احمد ندیم قاسمی

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے

کوہِ غم پر جو دیکھوں تو مجھے
دشت، آغوشِ فنا لگتا ہے

سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے، فضا لگتا ہے

مسکراتا ہے جو اس عالم میں!
بخدا، مجھ کو خدا لگتا ہے

نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شکر کرتا ہوں، گلہ لگتا ہے

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے

اس قدر تند ہے رفتارِ حیات
وقت بھی رشتہ بپا لگتا ہے

○

○

مجھ سے کافر کو ترے عشق نے یوں فرمایا
دِل تجھے دیکھ کے دھڑکا تو خدا یاد آیا

میرا معیار وفا ہی مری مجبوری ہے
رُخ بدل کر بھی تجھے اپنا مقابل پایا

پھر تری یاد کے دم سے پلٹ آیا ماضی
پھر وہی صبح ہوئی پھر وہی بادل چھایا

چارہ گر آج ستاروں کی قسم کھا کے بتا
کس نے انساں کو تبسّم کے لیے ترسایا

نذر کرتا رہا مَیں پھول سے جذبات اُسے
جس نے پتھر کے کھلونوں سے مجھے بہلایا

گھنے اشجار میں اُلجھے رہے کاکُل شب کے
چاند نے دستِ تجلّی تو بہت پھیلایا

لوگ ہنستے ہیں تو اس سوچ میں کھو جاتا ہوں
موجِ سیلاب نے پھر کس کا گھروندا ڈھایا

اس کے اندر کوئی فنکار چھُپا بیٹھا ہے
جانتے بوجھتے جس شخص نے دھوکا کھایا

———— ❊ ————

قتیلؔ شفائی

تہہ میں جو رہ گئے، وہ صدف بھی نکالیے
طغیانیوں کا ہاتھ سمندر میں ڈالیے

اپنی حدوں میں رہیئے کہ رہ جائے آبرو
اُوپر جو دیکھنا ہے تو پگڑی سنبھالیے

خوشبو تو مدّتوں کی زمیں دوز ہو چکی
اب صرف پتیوں کو ہوا میں اُچھالیے

صدیوں کا فرق پڑتا ہے لمحوں کے پھیر میں
جو غم ہے آج کا اسے کل پر نہ ٹالیے

آیا ہی تھا ابھی میرے لب پہ وفا کا نام
کچھ دوستوں نے ہاتھ میں پتھر اُٹھا لیے

کہہ دو صلیبِ شب سے کہ اپنی منائے خیر
ہم نے تو پھر چراغ سَروں کے جلا لیے

دُنیا کی نفرتیں مجھے قلاش کر گئیں
اِک پیار کی نظر میرے کاسے میں ڈالیے

رُسوائیوں کا آپ کو آیا ہے اب خیال
ہم نے تو اپنے دوست بھی دشمن بنا لیے

ساحل کے انتظار میں چکرا گیا ہوں میں
مجھ کو میری وفا کے بھنور سے نکالیے
محسوس ہو رہا ہے مجھے ایسا کچھ قتیلؔ
نیندوں نے جیسے آج کی شب پر لگا لیے

خود اپنے ہی باطن سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر

مجید امجد

برس گیا بہ خراباتِ آرزو، تیرا غم
قدح قدح تیری یادیں، سُبو سُبو تیرا غم
ترے خیال کے، پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا
لہک رہا تھا زمانے میں چار سُو تیرا غم
غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن، تیری دُھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبِ جُو، تیرا غم
ندی پہ چاند کا پَرتو، ترا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص، تو تیرا غم
تجملِ زیست کی چھاؤں میں لے بہ لب، تیری یاد
فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جو تیرا غم
طلوعِ مہر شگفتِ سحر سیاہیٔ شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، تیرا غم
نگہ اُٹھی، تو زمانے کے سامنے تیرا روپ
پلک جھکی، تو میرے دل کے رُوبرو تیرا غم

○

جب اِک چراغِ راہ گزر کی کرن پڑے
ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے

یہ کس حسیں دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی
ہر موجۂ خیال پہ صدہا شکن پڑے

اک پل بھی کنجِ دل میں نہ ٹھیرا وہ رہ نورد
اب جس کے نقشِ پا ہیں چمن در چمن پڑے

اک جست اس طرف بھی غزالِ زمانہ رقص
رہ تیری دیکھتے ہیں خطا و ختن پڑے

جب انجمن تموجِ صد گفتگو میں ہو
میری طرف بھی اِک نگۂ کم سخن پڑے

صحرائے زندگی میں جدھر بھی قدم اُٹھیں
رستے میں ایک آرزوؤں کا چمن پڑے

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دیدوں جو بن پڑے

امجدؔ طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اِک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

———— ✧ ————

ساحر لدھیانوی

محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر بھی یہ پی لیا میں نے
ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں اکثر میں
کہ اب تک کس تمنّا کے سہارے جی لیا میں نے
انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدّت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے
بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو، بیکار امیدو!
بہت دُکھ سہہ لیے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

○

جب کبھی ان کی توجّہ میں کمی پائی گئی
از سرِ نو داستانِ شوق دُہرائی گئی
اے غمِ دُنیا! تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی
ہم کریں ترکِ وفا اچھا چلو یونہی سہی
اور اگر ترکِ وفا سے بھی نہ رُسوائی گئی

کیسے کیسے چشم و عارض گردِ غم سے بجھ گئے
کیسے کیسے پیکروں کی شانِ زیبائی گئی
دِل کی دھڑکن میں توازن آچلا ہے خیر ہو
میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی!

○

ہو نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں
ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں
ابھی نہ چھیڑ محبّت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں
گریز کا نہیں قائل حیات سے، لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں
یہ کِس مقام پر پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

○

اہلِ دل اور بھی ہیں، اہلِ وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں دُنیا سے خفا اور بھی ہیں

ہو ہی جائے گی کسی روز رفو کی تدبیر
چاکِ دِل اور بھی ہیں، چاکِ قبا اور بھی ہیں

کیا ہُوا گر مرے یاروں کی زُبانیں چُپ ہیں
مرے شاہد مرے یاروں کے سوا اور بھی ہیں

سَر سلامت ہے تو کیا سنگِ ملامت کی کمی
جان باقی ہے تو پیکانِ قضا اور بھی ہیں

منصفِ شہر کی توقیر نہ کم ہو جائے
لوگ کہتے ہیں کہ اربابِ جفا اور بھی ہیں

کیوں نہ سَر اپنا اب اس دَر سے اُٹھا لیں یارو
سجدہ کرنا ہے تو نقشِ کفِ پا اور بھی ہیں

ظہیر کاشمیری

لوحِ مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا
ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا

بدنام ہو کے عشق میں سُرخرو ہوئے
اچھا ہُوا کہ نام گیا، ننگ رہ گیا

ہوتی نہ ہم کو سایۂ دیوار کی تلاش
لیکن محیطِ زیست بہت تنگ رہ گیا

سیرت نہ ہو تو، عارض ورخسار سب غلط
خوشبو اُڑی تو پھُول فقط رنگ رہ گیا

اپنے گلے میں اپنی ہی بانہوں کو ڈالیے
جینے کا اب تو ایک یہی ڈھنگ رہ گیا

کتنے ہی انقلاب شکن در شکن ملے
آج اپنی شکل دیکھ کے میں دنگ رہ گیا

تخیّل کی حدوں کا تعیّن نہ ہو سکا
لیکن محیط زیست بہت تنگ رہ گیا

کل کائنات فکر سے آزاد ہو گئی
اِنساں مثالِ دستِ تہِ سنگ رہ گیا

ہم ان کی بزمِ ناز میں یوں چُپ ہوئے ظہیرؔ
جس طرح گھُٹ کے ساز میں آہنگ رہ گیا

شعروں کی ڈکشنری

شعرستان

مختلف عُنوانات کے تحت ہزاروں اشعار کا خوبصورت انتخاب

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیب رامپوری

ادا جعفری

جب دِل کی رہگذر پہ ترا نقشِ پا نہ تھا
جینے کی آرزو تھی مگر حوصلہ نہ تھا

آگے حریمِ غم سے کوئی راستہ نہ تھا
اچھا ہُوا کہ ساتھ کسی کو لیا نہ تھا

دامانِ چاک چاک گلوں کو بہا نہ تھا
ورنہ نگاہ و دِل میں کوئی فاصلہ نہ تھا

کچھ لوگ شرمسار، خدا جانے کیوں ہوئے
اِن سے تو روحِ عصر، ہمیں کچھ گِلہ نہ تھا

جلتے رہے خیال، برستی رہی گھٹا
ہاں نازِ آگہی تجھے کیا کچھ روا نہ تھا

سنسان دوپہر ہے، بڑا جی اُداس ہے
کہنے کو ساتھ ساتھ ہمارے زمانہ تھا

ہر آرزو کا نام نہیں آبروئے جاں
ہر تشنہ لب جمالِ رُخِ کربلا نہ تھا

آندھی میں برگِ گُل کی زباں سے ادا ہوا
وہ راز جو کسی سے ابھی تک کہا نہ تھا

○

ہر لفظ دِل کی آرزو ، ہر چہرہ آئینہ لگے
ہم خوش یقیں اِتنے ہمیں ہر خواب ہی سچّا لگے

میراث ہے یہ امتحاں ، جانِ حزیں یہ بھی سہی
جب تشنگی حد سے بڑھے ہٹتا ہوا دریا لگے

خوابوں کی وادی میں پھرے بیتاب سی بے حال سی
یہ زندگی مجھ کو کوئی بھولا ہوا وعدہ لگے

جس بات پہ ہنسنا بہت اُس بات پہ رونا بہت
احوال اپنا بھی ہمیں کچھ داستانوں سا لگے

معلوم تو ہم کو بھی تھا ہے آسرا جی کا زیاں
یہ ناتواں سا رابطہ دِل کو مگر اچھا لگے

اِک زرد پتّے کے قریں ٹہنی پہ یہ کھلتی کلی
اِس آن تو دِل کو مرے ہر فاصلہ چھوٹا لگے

اِک کم سخن فرمان سا ، اِک آن کیا پیغام سا
مجھ کو تو سنگِ راہ تک اس کا ہی نقشِ پا لگے

ہر شخص ہی گم سا یہاں دِل سے کبھی پوچھو ادا
پر دشتِ شب کا راہرو کیوں اس قدر تنہا لگے

——— ※ ———

خاطرؔ غزنوی

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

گرمیٔ محفل فقط اِک نعرۂ مستانہ ہے
اور وہ خوش ہیں کہ اس محفل سے دیوانے گئے

میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے

یوں تو وہ میری رگِ جاں سے بھی تھے نزدیک تر
آنسوؤں کی دُھند میں لیکن نہ پہچانے گئے

وحشتیں کچھ اس قدر اپنا مقدّر ہو گئیں
ہم جہاں پہنچے ہمارے ساتھ ویرانے گئے

اب بھی ان یادوں کی خوشبو ذہن میں محفوظ ہے
بارہا ہم جن سے گلزاروں کو مہکانے گئے

کیا قیامت ہے کہ خاطرؔ کشتۂ شب بھی تھے ہم
صبح بھی آئی تو مجرم ہم ہی گردانے گئے

سیف الدین سیفؔ

میری داستانِ حسرت وہ سُنا سُنا کے روئے
مرے آزمانے والے، مجھے آزما کے روئے

کوئی ایسا اہلِ دِل ہو کہ فسانۂ محبت
میں اسے سُنا کے روؤں وُہ مجھے سُنا کے روئے

مری آرزو کی دُنیا دلِ ناتواں کی حسرت
جسے کھو کے شادماں تھا، اُسے آج پا کے روئے

تری بے وفائیوں پر، تری کج ادائیوں پر
کبھی سَر جھکا کے روئے، کبھی منہ چھپا کے روئے

جو سنائی انجمن میں شبِ غم کی آپ بیتی!
کئی رو کے مُسکرائے، کئی مسکرا کے روئے

○

چَین اب مجھ کو تہِ دام تو لینے دیتے
تیرے فِتنے کہیں آرام تو لینے دیتے

آپ نے اس کا تڑپنا بھی گوارا نہ کیا
دلِ مضطر سے کوئی کام تو لینے دیتے

موت بھی بس میں نہیں ہے ترے مجبوروں کی
زندگی میں کوئی الزام تو لینے دیتے

پل میں منزل پہ اُڑا لائے فنا کے جھونکے
لطف رہ رہ کے بھر گام تو لینے دیتے

ہاتھ بھی تیری نگاہوں نے اُٹھانے نہ دیا
دلِ بے تاب ذرا تھام تو لینے دیتے

سبقت ہر بار اشاروں میں کیا اس کو خطاب
لوگ اس بات کا مجھے نام تو لینے دیتے

زندگی کیا ہے، بس اک رات کا افسانہ ہے
ایک ہی شب کو سہی، پیار کا موسم تو ملے

منیر نیازی

اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ اجنبی سے منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

لائی ہے اَب اُڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رُت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو

پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

شامِ اَلم ڈھلی تو چلی درد کی ہوا
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دُھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

○

خاکِ میداں کی حدتوں میں سفر
جیسے حیرت کی وسعتوں میں سفر

خوب لگتا ہے اس کے ساتھ مجھے
وصل کی شب کی خواہشوں میں سفر
اس نگہ میں قیام ایسا ہے
جیسے بے انت پانیوں میں سفر
دیر تک سیرِ شہر خوباں کی
دیر تک دل کے موسموں میں سفر
بیٹھے بیٹھے منیرؔ تھک سے گئے
کر کے دیکھیں گے ان دنوں میں سفر

○

بے چین بہت پھرنا گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا
چھلکائے ہوئے چلنا خوشبو لبِ لعلیں کی!
اک باغ سا ساتھ اپنے لہکائے ہوئے رہنا!
اک شام سی کر رکھنا کاجل کے کرشموں سے
اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا
عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیرؔ اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اُکتائے ہوئے رہنا

ظفر اقبال

خوش بہت پھرتے ہیں وہ گھر میں تماشا کر کے
کام نکلا تو ہے ان کا مجھے رُسوا کر کے

فرق اتنا نہ سہی عشق و ہوس میں لیکن
میں تو مر جاؤں ترا رنگ بھی میلا کر کے

صاف شفاف تھی پانی کی طرح نیّتِ دل
دیکھنے والوں نے دیکھا اسے گدلا کر کے

یہ بھی کہنے کا مجھے حق تو نہیں ہے لیکن
یُوں بُرا بھی نہیں کرتا کوئی اچّھا کر کے

روک رکھنا تھا ابھی اور یہ آواز کا رس
بیچ لینا تھا یہ سودا ذرا مہنگا کر کے

مجھ سے چھڑوائے مرے سارے اصول اس نے ظفؔر
کتنا چالاک تھا، مارا مجھے تنہا کر کے

احمد فراز

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بُت ہے یا خدا، دیکھا نہ جائے
یہ کن نظروں سے تونے آج دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے
ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جاؤ
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے
یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے
کہ مجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے
فرازؔ اپنے سوا ہے کون تیرا؟
تجھے تجھ سے جُدا دیکھا نہ جائے

○

اَب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
ڈھونڈ اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو!
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تُو خدا ہے، نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں!

اب نہ وہ میں، نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں!

○

رنجش ہی سہی، دِل ہی دُکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مُجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبّت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی، پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دُنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کِس کِس کو بتائیں گے جُدائی کا سبب ہم
تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اے راحتِ جاں! مجھ کو رُلانے کے لیے آ
اِک عمر سے ہوں لذّتِ گریہ سے بھی محروم

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں اُمیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

ساغر صدیقی

چراغِ طور جلاؤ! بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اُٹھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بُلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

مجھے خود اپنی نگاہوں پر اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ! بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈھ کے لاؤ! بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اُجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں!
وہ روشنی سی پلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبینانِ خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ! بڑا اندھیرا ہے

شکیب جلالی

ساحل تمام اشکِ ندامت سے اَٹ گیا!
دریا سے کوئی شخص تو پیاسا پلٹ گیا
لگتا تھا بے کراں مجھے صحرا میں آسماں!
پہنچا جو بستیوں میں تو خانوں میں بٹ گیا
یا اِتنا سخت جان کہ تلوار بے اثر
یا اِتنا نرم دِل کہ رگِ گُل سے کٹ گیا
بانہوں میں آسکا نہ حویلی کا ایک ستون
پُتلی میں میری آنکھ کی صحرا سمٹ گیا
اب کون جائے کُوئے ملامت کو چھوڑ کر
قدموں میں آکے اپنا ہی سایہ لپٹ گیا
رکھتا ہے خود سے کون حریفانہ کش مکش
میں تھا کہ رات اپنے مقابل میں ڈٹ گیا
وہ لمحہِ شعور جسے جانکنی کہیں!
چہرے سے زندگی کے، نقابیں اُلٹ گیا
ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور
رستے میں جو کھڑا تھا وہ کہسار ہٹ گیا

اک حشر سا بپا تھا مرے دِل میں اے شکیبؔ
کھولیں جو کھڑکیاں تو ذرا شور گھٹ گیا

○

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت!

کسی کے سر پہ کبھی ٹوٹ کر گرا ہی نہیں
اس آسماں نے ہوا میں قدم جمائے بہت

نہ جانے رُت کا تصرّف تھا یا نظر کا فریب
کلی وہی تھی مگر رنگ جھلملائے بہت!

ہوا کا رُخ ہی اچانک بدل گیا ورنہ
مہک کے قافلے صحرا کی سمت آئے بہت

یہ کائنات ہے میری ہی خاک کا ذرّہ
میں اپنے دشت سے گزرا تو بھید پائے بہت

جو موتیوں کی طلب نے کبھی اداس کیا
تو ہم بھی راہ سے کنکر سمیٹ لائے بہت

بس ایک رات ٹھہرنا ہے، کیا گلہ کیجے
مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت

جمی رہے گی نگاہوں پہ تیرگی دن بھر
کہ رات خواب میں تارے اُتر کے آئے بہت!

شکیبؔ کیسی اُڑان، اب وُہ پَر ہی ٹوٹ گئے
کہ زیرِ دام جب آئے تھے، پھڑپھڑائے بہت

مُصطفٰے زیدی!

کِسی اور غم میں اِتنی خلش نہاں نہیں ہے
غمِ دِل، مرے رفیقو! غمِ رائیگاں نہیں ہے
کوئی ہم نفس نہیں ہے، کوئی رازداں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک، سو وہ مہرباں نہیں ہے
میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسم، مرا ترجماں نہیں ہے
کِسی آنکھ کو صدا دو، کِسی زلف کو پکارو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے
انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ!
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

شکیلؔ بدایونی

بہار آئی کسی کا سامنا کرنے کا وقت آیا
سنبھل اے دل کہ اظہارِ وفا کرنے کا وقت آیا

انہیں آمادۂ مہر و وفا کرنے کا وقت آیا
بڑی مدت میں عرضِ مدعا کرنے کا وقت آیا

رواں ہیں اپنے مرکز کی طرف آسودہ اُمیدیں
ہجوم یاس کو دل سے جُدا کرنے کا وقت آیا

پھر اک گم کردہ راہِ زندگی کو مل گئی منزل
سجودِ شکرِ بے پایاں ادا کرنے کا وقت آیا

کبھی دُوری تھی لیکن اب خیالِ خوفِ دُوری ہے
فغاں کی ساعتیں گزریں دعا کرنے کا وقت آیا

کہاں تک ختم رہتا درمیاں پردل کا افسانہ
بالآخر درمیاں سے ابتدا کرنے کا وقت آیا

ہر اک جرم محبت اس نگاہِ لطیف پر ہمد تے
نویدِ عافیت لے کر خطا کرنے کا وقت آیا

نگاہ و دل سے اب تفسیر و شرحِ آرزو ہوگی
زبان ولب سے ترکِ التجا کرنے کا وقت آیا

وہ آتے ہیں شکیلؔ اب اپنے دل سے ہاتھ دھو بیٹھو
نگاہِ ناز کی قیمت ادا کرنے کا وقت آیا!

○

پھر دل میں اُٹھی اِک موجِ شباب آہستہ آہستہ
پھر آیا زندگی میں انقلاب آہستہ آہستہ
یہ محفل زاہدانِ خُشک کی محفل ہے اے ندو
ذرا اس بزم میں ذکرِ شراب آہستہ آہستہ
مری نظریں مجھی کو رفتہ رفتہ بھُولے جاتی ہیں
ہُوئے جاتے ہیں جلوے کامیاب آہستہ آہستہ
نہ کہیئے، ہاں نہ کہیئے آپ کو ہم سے محبّت ہے
نگاہیں خود ہی دے دیں گی جواب آہستہ آہستہ
شکیلؔ اس درجہ مایوسی شروعِ عشق میں کیسی؟
ابھی تو اور ہوتا ہے خراب آہستہ آہستہ

مجروح سلطانپوری

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اُٹھتی ہے ہر نگہ خریدار کی طرح

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح

وہ کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہِ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یوں ہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

اب جا کے، کچھ کھلا ہنر، ناخنِ جنوں
زخمِ جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

ناصر کاظمی

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ

بس ایک موتی سی چھب دکھا کر ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا، برنگِ خوابِ سحر گیا وہ

خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم، نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہردم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں مرے تو دل میں اُتر گیا وہ

نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا
یونہی ذرا سی کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی، بدل چلا رنگِ آسماں بھی
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے، جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں، گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہم سفر تھا، مثالِ گردِ سفر گیا وہ

ہوس کی بنیاد پر نہ ٹھہرا، کسی بھی اُمید کا گھروندا
چلی ذرا سی ہوا مخالف، غبار بن کر بکھر گیا وہ

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اُس میں گزر گیا میں، ٹھہر گیا وہ

وہ میکدے کو جگانے والا، وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تری گلی سے، نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

وہ ہجر کی رات کا ستارا، وہ ہم نفس، ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

○

دِل میں اِک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دِل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

کچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی
اور یہ چوٹ بھی نئی ہے ابھی

جی جلانے دے ہم نفس، کہ مجھے
فرصتِ نالۂ شبی ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تو شریکِ سخن نہیں تو کیا!
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تم تو یارو ابھی سے اُٹھ بیٹھے!
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

○

ترے خیال سے لَو دے اُٹھی ہے تنہائی
شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گذرا!
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

دلِ فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور اٹھا
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی

میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پڑا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی

جہاں بھی تھا کوئی فتنہ تڑپ کے جاگ اٹھا
تمام ہوش تھی مستی میں تیری انگڑائی

کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا
وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے نہ شہر نہ رعنائی

وہ تاب درد، وہ سودائے انتظار کہاں
ان ہی کے ساتھ گئی طاقتِ شکیبائی

پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

○

یاس میں جب کوئی آنسو نکلا
اِک نئی آس کا پہلو نکلا

لے اُڑی سبزۂ خود رو کی مہک
پھر تری یاد کا پہلو نکلا

آ بسیں ساون کی اندھیری راتیں
کہیں تارا کہیں جگنو نکلا

نئے مضمون سجھاتی ہے صبا
کیا اِدھر سے وہ سمن بو نکلا

کئی دن رات سفر میں گذرے
آج تو چاند لبِ جُو نِکلا

طاقِ میخانہ میں چاہی تھی اماں!
وہ بھی تیرا خمِ ابرو نکلا

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اِتنی تھی کہ آنسُو نِکلا

○

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پہ خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق، تجھے گھر ہی لے چلیں

○

○

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا

جدائیوں کے زخم دردِ زندگی نے بھر دیئے
اسے بھی نیند آگئی مجھے بھی صبر آگیا

وہ دوستی تو خیر اب نصیبِ دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی انہیں کہ آسمان کھا گیا

یہ صبح کی سفیدیاں یہ دوپہر کی زردیاں
میں آئینے میں دیکھتا ہوں میں کہاں چلا گیا

یہ کس خوشی کی ریت پر غموں کو نیند آگئی
وہ لہر کس طرف گئی یہ میں کہاں سما گیا

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو اٹھو کہ آفتاب سر پہ آگیا

———٭———

سلیم احمد

جا کے پھر لوٹ جو آئے وہ زمانہ کیسا
تیری آنکھوں نے یہ چھیڑا ہے فسانہ کیسا

آنکھ سرشارِ تمنّا ہے تو وعدہ کر لے
چال کہتی ہے کہ اب لوٹ کے آنا کیسا

مجھ سے کہتا ہے کہ سائے کی طرح ساتھ ہیں ہم
یوں نہ ملنے کا نکالا ہے بہانہ کیسا

اس کا شکوہ تو نہیں ہے، نہ ملے تم ہم سے
رنج اس کا ہے کہ تم نے ہمیں جانا کیسا

خود بھی سوچا تھا بہت اسے بھی پوچھا تھا بہت
حال جب خود ہی نہ سمجھے تو سنانا کیسا

تجھ کو پانے کی ہوس تھی سو کسے تھا معلوم
اپنے ہی آپ کو کھو بیٹھیں گے، پانا کیسا

ابنِ انشاء

اِنشاء جی اُٹھو اب کوُچ کرو، اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

پھر ہجر کی لمبی رات یہاں، سنجوگ کی تو بس ایک گھڑی
جو دِل میں ہے لب پر آنے دو، شرمانا کیا، گھبرانا کیا؟

اس دل کے دریدہ دامن میں، دیکھو تو سہی سوچو تو سہی
جس جھولی میں سو چھید ہوئے، اس جھولی کا پھیلانا کیا

اِس روز جو اُن کو دیکھا ہے، اب خواب کا عالم لگتا ہے
اس روز جو ان سے بات ہوئی، وہ بات بھی تھی افسانہ کیا

اس حُسن کے سچّے موتی کو ہم دیکھ سکیں پر چھُو نہ سکیں
جسے دیکھ سکیں پر چھُو نہ سکیں، وہ دولت کیا وہ خزانہ کیا

شب گزری، چاند بھی ڈوب گیا، زنجیر پڑی دروازے پر
کیوں دیر گئے گھر آئے ہو، سجنی سے کرو گے بہانا کیا

رہتے ہو جو ہم سے دُور بہت مجبُور ہو تم مجبور بہت
ہم سمجھوں کا سمجھانا کیا، ہم بھلوں کا بھلانا کیا

اس کو بھی جلا رکھتے ہوئے من اک شعلہ لال بھبوکا بن
یوں آنسو بن بہ جانا کیا، یوں ماٹی میں مل جانا کیا

جب شہر کے لوگ نہ رستہ دیں کیوں بن میں نہ جا بسرام کریں
دیوانوں کی سی نہ بات کرے تو اور کرے دیوانا کیا؟

○

کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرہ ترا

ہم بھی وہیں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کئے
ہم ہنس دیئے، ہم چپ رہے منظور تھا پردہ ترا

اس شہر میں کس سے ملیں، ہم سے تو چھوٹی محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا

کوچے کو تیرے چھوڑ کر، جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے، پربت ترے، بستی تری صحرا ترا

تو باوفا، تو مہرباں، ہم اور تجھ سے بدگماں؟
ہم نے تو پوچھا تھا ذرا، یہ وصف کیوں ٹھہرا ترا

بے شک اسی کا دوش ہے، کہتا نہیں خاموش ہے
تو آپ کر ایسی دوا، بیمار ہو اچھا ترا!

ہم اور رسم بندگی؟ آشفتگی؟ اُفتادگی؟
احسان ہے کیا کیا ترا، اے حسن بے پروہ ترا

دو اشک جانے کس لیے، پلکوں پہ آ کے ٹک گئے
اَلطاف کی بارش تری، اکرام کا دریا ترا

اے بے دریغ و بے اماں، ہم نے کبھی کی ہے فغاں؟
ہم کو تری وحشت سہی، ہم کو سہی سودا ترا

ہم پر یہ سختی کی نظر؟ ہم ہیں فقیرِ رہگذر
رستہ کبھی روکا ترا؟ دامن کبھی تھاما ترا

ہاں ہاں تری صورت حسیں، لیکن تو اتنا بھی نہیں
اس شخص کے اشعار سے شہرہ ہوا کیا کیا ترا

بے درد سنتی ہو تو چل، کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق ترا، رسوا ترا، شاعر ترا، انشاؔ ترا

پھول کے معنی پھول ہیں پیارے خار کے معنی خار
اور زیادہ سوچنے والے، سودائی کہلائیں

شہزاد احمد

نہ سہی کچھ مگر اتنا تو کیا کرتے تھے
وہ مجھے دیکھ کے پہچان لیا کرتے تھے

آخرِ کار ہوئے تیری رضا کے پابند
ہم کہ ہر بات پہ اصرار کیا کرتے تھے

خاک ہیں اب تیری گلیوں کی وہ عزت والے
جو ترے شہر کا پانی نہ پیا کرتے تھے

اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں
لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے

دوستو! اب مجھے گردن زدنی کہتے ہو
تم وہی ہو کہ مرے زخم سیا کرتے تھے

ہم جو دستک کبھی دیتے تھے صبا کی مانند
آپ دروازۂ دل کھول لیا کرتے تھے

اب تو شہزاد ستاروں پہ لگی ہیں نظریں
کبھی ہم لوگ بھی مٹی میں جیا کرتے تھے

O

اپنی تصویر کو آنکھوں سے لگاتا کیا ہے
اِک نظر میری طرف بھی ترا جاتا کیا ہے

مری رسوائی میں وہ بھی ہیں برابر کے شریک
مرے قِصّے مرے یاروں کو سُناتا کیا ہے

پاس رہ کر بھی نہ پہچان سکا تُو مجھ کو
دُور سے دیکھ کے اب ہاتھ ہلاتا کیا ہے

ذہن کے پردوں پہ منزل کے ہیولے نہ بنا
غور سے دیکھتا جا، راہ میں آتا کیا ہے

زخمِ دِل جُرم نہیں، توڑ بھی مُہرِ سکوُت
جو مجھے جانتے ہیں ان سے چھپاتا کیا ہے

عمر بھر اپنے گریباں سے اُلجھنے والے
تُو مجھے میرے ہی سائے سے ڈراتا کیا ہے

مر گئے پیاس کے مارے تو اُٹھا ابرِ کرم
بجھ گئی بزم تو اب شمع جلاتا کیا ہے

میں ترا کچھ بھی نہیں ہوں مگر اتنا تو بتا
دیکھ کر مجھ کو ترے ذہن میں آتا کیا ہے

ترا احساس ذرا سا، تری ہستی پایاب
تو سمندر کی طرح شور مچاتا کیا ہے

تجھ میں کشش ہی ہے تو دُنیا کو بہا کر لے جا
چائے کی پیالی میں طوفاں اُٹھانا کیا ہے

تیری آواز کا جادو نہ چلے گا ان پر
جاگنے والوں کو شہزادہ جگانا کیا ہے

شعروں کی ڈکشنری

شعرستان

مختلف عنوانات کے تحت ہزاروں اشعار کا خوبصورت انتخاب

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیب رامپوری

مُرتضیٰ برلاس

اِک برگِ سبز شاخ سے کر کے جُدا بھی دیکھ
میں پھر بھی جی رہا ہوں، مرا حوصلہ بھی دیکھ

ذرّے کی شکل میں تجھے سمٹا ہوا تھا جان
صحرا کے روپ میں مجھے پھیلا ہوا بھی دیکھ

تُو نے تو مشتِ خاک سمجھ کے اُڑا دیا
اب مجھ کو اپنی راہ میں بکھرا ہوا بھی دیکھ

مانا کہ تیرا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں
ملنے کے بعد مجھ سے ذرا آئینہ بھی دیکھ

تیرے لیے تو حرف اشاروں کا کھیل تھا
مجھ کو جو پیش آیا ہے، وُہ حادثہ بھی دیکھ

اوروں کے پاس جا کے مری داستاں نہ پوچھ
جو کچھ ہے میرے چہرے پہ لکھا ہوا بھی دیکھ

ہموار راستوں پہ مرا ساتھ چھوڑ کر
آگے نِکل گیا ہے تو اب راستہ بھی دیکھ

چہرے کی چاندنی پہ نہ اِتنا بھی مان کر
وقتِ سحر تُو رنگ کبھی چاند کا بھی دیکھ

غلام جیلانی اصغر

ہمارا ان کا تعلق جو رسم و راہ کا تھا
بس اس میں سارا سلیقہ میرے نباہ کا تھا

تجھے قریب سے دیکھا تو دل نے سوچا ہے
کہ تیرا حسن بھی اِک زاویہ نگاہ کا تھا

تجھے تراش کے دل میں سجا لیا میں نے
تصور اس میں مری رفعتِ نگاہ کا تھا

چلے تھے یوں تو کئی لوگ کوئے جاناں کو
ذرا سے ہم سے مگر اختلاف راہ کا تھا

تری جفا کا خدا سلسلہ دراز کرے
کہ اس سے اپنا تعلق بھی گاہ گاہ کا تھا

زہرانگاہ

چمک رہی ہے مئے تابِ تشنگی کے لیے
سنور رہی ہے تری بزم برہمی کے لیے

نہیں نہیں، ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لیے

جہانِ نَو کا تصوّر، حیاتِ نَو کا خیال
بڑے فریب دیئے تم نے بندگی کے لیے

مئے حیات میں شامل ہے تلخیٔ دوراں
جبھی تو پی کے ترستے ہیں بیخودی کے لیے

کہاں کے عشق و محبّت، کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

جو ظلمتوں میں ہو پیدا ہو قلبِ انساں سے
ضیاء نواز وہ شعلہ ہے تیرگی کے لیے

شاذ تمکنت

وہ نیاز و ناز کے مرحلے نگہ و سخن سے چلے گئے !
ترے رنگ و بُو کے وہ قافلے ترے پیرہن سے چلے گئے

کوئی آس ہے نہ ہراس ہے، شبِ ماہ کتنی اُداس ہے
وہ جو رنگ رنگ کے عکس تھے وہ کرن کرن سے چلے گئے

کوئی ان کی آنکھیں سراہنا، کوئی وحشتوں سے نباہنا
کہ وہ آہوانِ رمیدہ خُو، یہ سُنا، ختن سے چلے گئے

کئی مہر و مہ اُتر آئے تھے، وہ یہیں تھے، مرے گھر آئے تھے
وہ گلی گلی سے در آئے تھے، وہ چمن چمن سے چلے گئے

مرے دل کی آب و ہوا لگی کہ وفا بھی ان کو خطا لگی !
وہی سادگی سے جو آئے تھے وہی بانکپن سے چلے گئے

نہ تو کفر کے نہ خدا کے ہم، نہ دوا کے ہم نہ دُعا کے ہم
کہ بتانِ کعبۂ آرزو دلِ برہمن سے چلے گئے !

یہ مرا فریبِ نظر نہیں مرے ہمقدم تھے یہیں کہیں !
مجھے آہٹیں بھی نہ مل سکیں، وہ بڑے جتن سے چلے گئے

یہ بجا کہ تحفۂ جاں لیے ترے پاس آئے تھے بے پیے
وہ گداگرانِ تہی سبو ترے حُسنِ ظن سے چلے گئے

یہی تجھ سے اپنا تھا واسطہ، یہی تھی حیاتِ معاشقہ
تری خلوتوں کے شریک تھے، تری انجمن سے چلے گئے

پسِ عمر بازوئے شوق پر سرِ ناز تھا تو ہوئی خبر
کئی رتجگے ترے گیسوؤں کی شکن شکن سے چلے گئے

وہ بجھے، وہ لٹے لٹے، سرِ راہ شاذؔ ملے تو تھے
انہیں اب وطن میں نہ ڈھونڈیئے کہ وہ اب وطن سے چلے گئے

○

شبِ وعدہ کہہ گئی ہے شبِ غم دراز رکھنا
اسے میں بھی راز رکھوں اسے تم بھی راز رکھنا

یہ ہے خار خار وادی یونہی زخم زخم چلنا
یہ ہے پتھروں کی بستی یونہی دل گداز رکھنا

ہمہ تن جنوں ہوں پھر بھی یہ ہے کچھ نوپرد داری
کہ بُرا نہیں خرد سے کوئی ساز باز رکھنا

مرے ناخنِ وفا پر کوئی قرض رہ نہ جائے
ترے دل میں جو گرہ اُسے نیم باز رکھنا

وہی لے جواں سُنی ہے وہی شاذؔ نغمگی بھی!
بہ حسابِ خامشی بھی مرے نے نواز رکھنا!

عبداللہ جاوید

چمکا جو چاند، رات کا چہرہ نکھر گیا
مانگے کا نور بھی تو بڑا کام کر گیا

یہ بھی ہے بہت، سینکڑوں پودے ہرے ہوئے
کیا غم جو بارشوں میں کوئی پھول مر گیا

ساحل پہ لوگ یوں ہی کھڑے دیکھتے رہے
دریا میں ہم جو اُترے تو دریا اُتر گیا

سایہ بھی آپ کا ہے فقط روشنی کے ساتھ
ڈھونڈو گے تیرگی میں کہ سایہ کدھر گیا

ہم جس کے انتظار میں جاگے تمام رات
آیا بھی وہ تو خواب کی صورت گزر گیا

ہم نے گل کی، چاند کی، تارے کی بات کی
سب اہلِ انجمن کا گماں آپ پر گیا

گھر ہی نہیں رہا ہے سلامت بتائیں کیا
جاوید کے بعد سیلِ بلا کس کے گھر گیا

اسلم انصاری

میں نے روکا بھی نہیں اور وُہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دِل نے بُھلایا بھی نہیں

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

دُور و نزدیک سے اُٹھتا نہیں شورِ زنجیر
اور صحرا میں کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں!

گل بہر رنگ تبسّم کا گنہ گار رہا!
زخم ہستی کا، سوا اس کے مداوا بھی نہیں

کون سا موڑ ہے، کیوں پاؤں پکڑتی ہے زمیں
اس کی بستی بھی نہیں، کوئی پکارا بھی نہیں

بے نیازی سے سبھی قریۂ جاں سے گزرے
دیکھتا کوئی نہیں ہے کہ تماشا بھی نہیں

وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تُو نے مُنہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

کِس کو نیرنگیٔ ایام کی صورت دکھلائیں
رنگ اُڑتا بھی نہیں، نقش ٹھہرتا بھی نہیں

یا ہمیں کو نہ ملا اس کی حقیقت کا سراغ
یا سراپردۂ عالم میں کوئی تھا بھی نہیں

ناصر زیدی

تھوڑا سا مُسکرا کے نگاہیں ملائیے
مجھ کو مری حیات کا مقصد بتائیے
مجھ سے بھی کچھ حضور، تعلق تھا آپ کا
یوں بے مروتی سے نہ دامن چھڑائیے
شاید کسی مقام پہ میں کام آ سکوں
مجھ کو بھی ساتھ لیجئے تنہا نہ جائیے
گزرے گا اس طرف سے بھی اک دن ہجوم گل
ہر چند آپ راہ میں کانٹے بچھائیے
ناصر اُداسیاں تو رہیں گی یونہی مدام
ڈھلنے لگی ہے رات، کوئی گیت گائیے

○

احساس کے شرر کو ہوا دینے آؤں گا
میں شہرِ جاں کو راکھ بنا دینے آؤں گا
لکھے تھے حرفِ شوق جو میں نے ترے لیے
اب آنسوؤں سے ان کو مٹا دینے آؤں گا

تُو نے عطا کئے ہیں مجھے کتنے دَرد و غم
اِس لُطفِ خاص کا میں صِلہ دینے آؤں گا

سمجھا دیا ہے تُو نے محبّت ہے اِک خطا
میں اس خطا کی خود کو سزا دینے آؤں گا

آیا تری گلی میں اگر لَوٹ کر کبھی!
گزرے ہوئے دنوں کو صدا دینے آؤں گا

پایا تھا راہِ شوق میں جو کرَبِ آگہی
اس کرَبِ آگہی کو سُلا دینے آؤں گا

باہر نِکل کے جسم کے زنداں سے ایک دن
میں تجھ کو زندگی کی دُعا دینے آؤں گا

میں کُشتۂ وفا سہی نا صِر مگر ضرور
اِک بے وفا کو دادِ وفا دینے آؤں گا

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں شاید مگر ایسے بھی ہیں

حمایت علی شاعر

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

کس لیے کیجئے کسی گم گشتہ جنّت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

کتنے سادہ دل ہیں، اب بھی سُن کے آوازِ جرس
پیش و پس سے بے خبر گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ

اپنے سائے سائے سر نیوڑھائے آہستہ خرام
جانے کس منزل کی جانب آج کل جاتے ہیں لوگ

شمع کے مانند، اہلِ انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ

شاعر ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سُنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

○

اس کے غم کو غمِ ہستی تو مرے دِل نہ بنا
زیست مشکل ہے اسے اور بھی مشکل نہ بنا

تُو بھی محدُود نہ ہو مجھ کو بھی محدُود نہ کر
اپنے نقشِ کفِ پا کو مری منزل نہ بنا

اور بڑھ جائے گی ویرانیٔ دِل جانِ جہاں
میری خلوت گہہِ خاموشی کو محفل نہ بنا

دِل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت جاں کا زیاں
عِشق کو عِشق سمجھ مشغلۂ دِل نہ بنا

پھر مری آس بندھا کر مجھے مایوس نہ کر
حاصلِ غم کو خدا را غمِ حاصل نہ بنا

ملکوں میں تجھے بانٹا اربابِ سیاست نے
فرقوں میں فقیہوں نے پیرانِ طریقت نے

شانِ الحق حقّی!

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنّا تھی کہ چاہے جاتے

دل کے ماروں کا نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصیب
زخم بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے

ہم نگاہی کی ہمیں خود بھی کہاں تھی توفیق
ہم نگاہی کے لیے عذر نہ چاہے جاتے

کاش اے ابرِ بہاری ترے بہکے سے قدم
میری اُمید کے صحرا میں بھی گاہے جاتے

ہم بھی کیوں دہر کی رفتار سے ہوتے پامال
ہم بھی ہر لغزشِ مستی کو سراہے جاتے

لذّتِ درد سے آسودہ کہاں دل والے
ہیں فقط درد کی حسرت سے کراہے جاتے

ہے ترے فتنۂ رفتار کا شہرہ کیا کیا
گرچہ دیکھا نہ کسی نے سرِ راہے جاتے

دی نہ مہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورنہ
اور کچھ دن غمِ ہستی سے نباہے جاتے

جمیل الدین عالیؔ

دلِ آشفتہ پہ الزام کئی یاد آئے
جب ترا ذکر چھڑا، نام کئی یاد آئے

تجھ سے چھٹ کر بھی گزرنی تھی سو گزری لیکن
لمحہ لمحہ، سحر و شام کئی یاد آئے

ہائے نوعمر ادیبوں کا یہ اندازِ بیاں
اپنے مکتوب ترے نام کئی یاد آئے

آج تک نہ مل سکا اپنی تباہی کا سراغ
یوں ترے نامہ و پیام کئی یاد آئے

کچھ نہ تھا یاد، بجز کارِ محبت، اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

اس قدر سادہ و بیباک ہے عالیؔ کہ ہمیں
اس پہ لگنے تھے جو الزام کئی یاد آئے

اختر امام رضوی

اپنا دکھ اپنا ہے پیارے، غیروں کو کیوں اُلجھاؤ گے
اپنے دُکھ میں پاگل ہو کر اب کس کو سمجھاؤ گے

درد کے صحرا میں لاکھوں اُمید کے لاشے گلتے ہیں
اِک ذرا سے دامن میں تم کس کس کو کفناؤ گے

توڑ بھی دو احساس کے رشتے چھوڑ بھی دو دکھ اپنا نے
رو رو کے جیون کاٹو گے رو رو کے مر جاؤ گے

راز کی بات کو خاموشی کا زہر سمجھ کر پی جانا
کہنے سے بھی رہ نہ سکو گے کہہ کر بھی پچھتاؤ گے

آج یہاں پردوں سے ادھر عریانی ہی عریانی ہے
تم بھی ننگے ہو کر ناچو یوں کب تک شرماؤ گے

محسنِ احسان!

شاخِ مژگانِ محبت پہ سجا لے مجھ کو
برگِ آوارہ ہوں، صرصر سے بچا لے مجھ کو

رات بھر چاند کی ٹھنڈک میں سلگتا ہے بدن
کوئی تنہائی کے دوزخ سے نکالے مجھ کو

دُور رہ کے بھی ہے ہر سانس میں خوشبو تیری
میں مہک جاؤں تو پاس بُلا لے مجھ کو

میں تیری آنکھ سے ڈھلکا ہوا اک آنسو ہوں
تو اگر چاہے بکھرنے سے بچا لے مجھ کو

شب غنیمت تھی کہ یہ زخم نظارہ تو نہ تھا
ڈس گئے صبحِ تمنا کے اُجالے مجھ کو

میں منقش ہوں تیری روح کی دیواروں پر
تو مٹا سکتا نہیں، بھولنے والے مجھ کو

صبح سے شام ہوئی، رُوٹھا ہوا بیٹھا ہوں
کوئی ایسا نہیں، آکر جو منا لے مجھ کو

نہ بہ نہ موجِ طلب کھینچ رہی ہے محسنؔ
کوئی گردابِ تمنا سے نکالے مجھ کو

حبیب جالب

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ ہنستا ہوا چاند، یہ پُر نور ستارے
تابندہ و پایندہ ہیں ذرّوں کے سہارے

حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے، کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے

ہر صبح، مری صبح پہ روتی رہی شبنم!
ہر رات میری رات پہ ہنستے رہے تارے

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں!
کب تک کوئی اُلجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

کشور ناہید

وہ اجنبی تھا، غیر تھا، کس نے کہا نہ تھا
دل کو مگر یقین کسی پر ہوا نہ تھا

ہم کو تو اضطرابِ غمِ دل عزیز تھی!
کچھ اس لیے بھی کم نگہی کا گلہ نہ تھا!

دستِ خیالِ یار سے چھوٹے شفق کے رنگ
نقشِ قدم بھی رنگِ حنا کے سوا نہ تھا

ڈھونڈا بہت اسے کہ بلایا تھا جس نے پاس
جلوہ مگر کہیں بھی صدا کے سوا نہ تھا

کچھ اس قدر تھی گرمیٔ بازارِ آرزو
دل جو خریدتا تھا اُسے دیکھتا نہ تھا

کیسے کریں گے ذکرِ حبیبِ جفا پسند
جب نام دوستوں میں بھی لینا روا نہ تھا

کچھ یونہی زرد زرد سی ناہید آج تھی!
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا!

○

یہ دل نے شرطِ وفا کا عجب ارادہ کیا
سفر کا قصد کیا، اور پا پیادہ کیا

سنبھال کر رُخِ خورشید اپنے ہاتھوں میں
سحر نے رنگ پہن کر ہوا کو جادہ کیا

اُسے تھا شوق سمندر کے ساتھ چلنے کا
سمجھ گئے تھے تو پھر دل کو کیوں کشادہ کیا

تمام فاصلے سمٹے تھے کوزۂ گُل میں
وہ سامنے تھا کہ جب اس کا رخ ارادہ کیا

بدن میں خوشبوئے جاں بھی ترے وصال سے تھی
اسی لیے تو ترا ہجر بھی زیادہ کیا

تجھے خبر بھی نہیں تیرے شب نشینوں نے
ستارۂ سحری کو زمیں نہادہ کیا

مقدّروں کے، شجر بے ثمر رہے ناہیدؔ!
اگرچہ ہم نے بہت فصلِ گُل لبادہ کیا

———— ⁘ ————

شہرت بخاری

سوادِ شہر فنا میں ہے قافلہ اب تو
نظر اُٹھاؤ کہ طوفان ٹل گیا اب تو

تہی ہے دامنِ گلزار رنگ و خوشبو سے
تری تلاش میں ہے کُو بہ کُو صبا اب تو

غمِ زمانہ سے ملنے لگا سکُوں دِل کو
ترے خیال سے ملتا ہے سلسلہ اب تو

تمہارا دھیان ہے کس کو تمہارا غم کس کو
بدل چکا ہے یہاں شیوۂ وفا اب تو

بدل چکے ہیں چلن عشق پیشہ لوگوں کے
رفو نہ ہو گا کبھی دامنِ جفا اب تو

رواں دواں تھے نہ جب تک تھا راہنما کوئی
قدم قدم پر اُلجھتا ہے راستہ اب تو

کہاں چلے ہو یہ دھندے بکھیر کر شہرت
کہ آفتاب لبِ بام آ چلا اب تو

○

○

خیال و خواب ہوئی ہیں محبتیں کیسی
لہو میں ناچ رہی ہیں قیامتیں کیسی

نہ شب کو چاند ہی اچھا نہ دن کو مہر اچھا
یہ ہم پہ بیت رہی ہیں وحشتیں کیسی

وہ ساتھ تھا تو خدا بھی تھا مہرباں کیا کیا
بچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کیسی

عذاب جس کا تبسّم، ثواب جس کی نگاہ
کھنچی ہوئی ہیں پسِ جاں یہ صورتیں کیسی

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

کوئی جو بے خبر گزرا تو یہ صدا دی ہے
میں سنگِ راہ ہوں مجھ پر عنایتیں کیسی

نہیں کہ حُسن کی تیز نگیوں میں طاق نہیں
جنوں بھی کھیل رہا ہے سیاستیں کیسی

نہ صاحبانِ جنوں ہیں نہ اہلِ کشت و کمال
فضا یہ ہو تو دلوں کی نزاکتیں کیسی

جو ابر ہے وہ سواب سنگ وحشت لاتا ہے
ہمارے عہد میں آئیں کثافتیں کیسی

یہ دورِ بے ہُنراں ہے بچا رکھو خود کو
یہاں صداقتیں کیسی، کرامتیں کیسی

انور شعورؔ

اور نہ در بدر پھرا اور نہ آزما مجھے
بس مرے پردہ دار اب نہیں حوصلہ مجھے

سخت نظر فریب ہے آئینہ خانۂ جمال
اس کی چمک دمک نہ دیکھ، دیکھ بجھا بجھا مجھے

حبسِ ہجومِ خلق سے گھُٹ کے الگ ہُوا تو میں
قطرہ یہ سطحِ بحر تھا چاٹ گئی ہوا مجھے!

صبر کرو، محاسبو، وقت نہیں بتائے گا
دہر کو میں نے کیا دیا دہر سے کیا مِلا مجھے

تیرے ہی مصر کا ملال تیرے ہی نجد کا خیال
شہر بہ شہر، کُو بکُو، گام بہ گام تھا مجھے

کارگہِ بقا مجھے ذات و حیات و کائنات
ذات و حیات و کائنات دائرۂ فنا مجھے

ذات و حیات و کائنات بے سر و پا و بے ثبات
بے سر و پا و ثبات شے سے اُمید کیا مجھے

رات لغاتِ عمر سے میں نے چنا تھا ایک لفظ
لفظ بہت عجیب تھا یاد نہیں رہا مجھے!

جو نہ سُنا تھا دہر سے اس کی زباں سے سن لیا
اب مجھے کوئی کچھ کہے فکر نہیں ذرا مجھے

فن کو سمجھ لیا گیا محض عطیۂ فلک
سعی و ریاض کا صلہ خوب دیا گیا مجھے

میں وہ نہیں کہ دوست کا نام ہی سُن کے جھوم اٹھوں
صرف مہک گلاب کی کچھ نہیں اے صبا مجھے

محرمِ خاص دیکھنا سو تو نہیں گیا شعور
دیر ہوئی سُنے ہوئے کوئی نئی صدا مجھے

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

صفدر میر

بہت جی ترستا رہا رات بھر
جو ہم سے بھی مل لو ملاقات بھر
بساطِ تمنّا اُلٹنے ہو کیوں ؟
کہ بازی یہ کھیلیں گے ہم بات بھر

ہے آنکھوں میں طوفاں بقدرِ جنوں
ہے دِل میں تمنّا خرابات بھر
نہیں مانگتے مستئ جاوداں
ہمیں چاہیئے مئے ، مدارات بھر

ذرا دیکھ لو میرے دِل کی طرف
یہ چھل بل ودیعت نہیں رات بھر
گھِر آئی اُمنڈ کر گھٹا چار اُدر
کھلے گی طبیعت نہ برسات بھر

عبیداللہ علیمؔ

بنا گلاب تو کانٹے چُبھا گیا اِک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اِک شخص

تمام رنگ مرے اور سارے خواب مرے
فسانہ تھے کہ فسانہ بنا گیا اِک شخص

میں کس ہوا میں اُڑوں کس فضا میں لہراؤں
دُکھوں کے جال ہر اک سُو بچھا گیا اِک شخص

پلٹ سکوں میں نہ آ گے ہی بڑھ سکوں جس پر
مُجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اِک شخص

محبتیں بھی عجب اس کی نفرتیں بھی کمال
مری طرح کا ہی مجھ میں سما گیا اِک شخص

محبتوں نے کسی کی بھُلا رکھا تھا اُسے
ملے وہ زخم کہ پھر یاد آ گیا اک شخص

وہ ماہتاب تھا، مرہم بدست آیا تھا
مگر کچھ اور سوا دل دُکھا گیا اِک شخص

کھُلا یہ راز کہ آئینہ خانہ ہے دُنیا
اور اس میں مجھ کو تماشا بنا گیا اِک شخص

جون ایلیا

سر ہی اب پھوڑیئے ندامت میں
نیند آنے لگی ہے فُرقت میں
وہ خلا ہے کہ سوچتا ہوں میں!
اس سے کیا گفتگو ہو خلوت میں

رُوح نے عِشق کا فریب دیا
جِسم کو جِسم کی عداوت نے
ہیں دلیلیں ترے خلاف مگر
سوچتا ہوں تری حمایت میں

ہے بس اب عادتوں کی خانہ پُری
رُوح شامل نہیں شکایت میں
عشق کو درمیاں نہ لاؤ کہ میں
چیختا ہوں بدن کی عسُرت میں

کون سمجھے کہ بے غرض جذبے
کتنے اوچھے ہیں اپنی فطرت میں
یہ کوئی کھیل تو نہیں ہے کریم
رُوٹھتے اب بھی ہیں مروّت میں

وہ جو تعمیر ہونے والی تھی
لگ گئی آگ اس عمارت میں

میرے کمرے کا کیا بیاں کہ یہاں
خون تھوکا گیا شرارت میں

زیست اب کس طرح بسر ہوگی
دل نہیں لگ رہا محبّت میں

جمیل یوسف

اب تو اپنے جسم کا سایہ بھی بیگانہ ہوا
میں تیری محفل میں آ کر اور بھی تنہا ہوا

وقفِ دردِ جاں ہوا، محوِ غمِ دنیا ہوا
دل عجب شے ہے، کبھی قطرہ کبھی دریا ہوا

تیری آہٹ کے تعاقب میں ہوں صدیوں سے رواں
راستوں کے پیچ و خم میں ٹھوکریں کھاتا ہوا

لذتِ دیدار کی اے ساعتِ رخشاں! ٹھہر
پڑھ رہا ہوں میں ترے چہرے پہ کچھ لکھا ہوا

اب تو ترے حسن کی ہر انجمن میں دھوم ہے
جس نے میرا حال دیکھا، تیرا دیوانہ ہوا

وہ سمے رخصت ہوئے ہمدم وہ شامیں کھو گئیں
کن خیالوں کے جھمیلوں میں ہے تو الجھا ہوا

صابر ظفرؔ

یہ سوچ کے راکھ ہو گیا ہوں
میں صبح سے شام تک چلا ہوں

دُھل جاؤں گا اگلی بارشوں میں
دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں

جس دِل میں پناہ ڈُھونڈتا تھا
اَب اِس سے پناہ مانگتا ہوں

مجھ کو ہے تمیز جھوٹ سچ کی
سچ یہ ہے کہ جھُوٹ بولتا ہوں

مرتا ہوں کہ مر مٹوں گا آخر
جینے کو تو عمر بھر جیا ہوں

ثروت حسین

دشت لے جائے کہ گھر لے جائے
تیری آواز جدھر لے جائے

اب یہی سوچ رہی ہیں آنکھیں
کوئی تا حدِّ نظر لے جائے

منزلیں بجھ گئیں آنکھوں کی طرح
اب جدھر راہ گزر لے جائے

تیری آشفتہ مزاجی اے دل
کیا خبر کون نگر لے جائے

سایۂ ابر سے پوچھو ثروت
اپنے ہمراہ اگر لے جائے

رئیس فروغ

گھر مجھے رات بھر ڈرائے گیا
میں دیا بن کے جھلملائے گیا

کل کسی اجنبی کا حسن مجھے
یاد آیا تو یاد آئے گیا!

کوئی گھائل زمیں کی آنکھوں میں
نیند کی کونپلیں رچائے گیا

سفرِ عشق میں بدن اس کا
دُور سے روشنی دکھائے گیا

اپنی لہروں میں رنج کا موسم
آنسوؤں کے کنول کھلائے گیا

شہر کا ایک برگِ آوارہ
دشت و در کی ہنسی اُڑائے گیا

اور مرا تین سال کا بچہ
اس حماقت پہ مُسکرائے گیا

مجھ میں کیا بات تھی رئیس فروغ
وہ سجن کیوں مجھے رجھائے گیا

آذرِ تمنّا

آنکھ حیرت میں جی ملال میں گم!
ہر کوئی اپنے ہی خیال میں گم
مست ہے کوئی خوابِ فردا میں
کوئی ماضی میں کوئی حال میں گم

میں کہ اندیشۂ جواب میں غرق
تو کہ رنجِ پسِ سوال میں گم
ایک لمحہ جو میرا لمحہ تھا!
ہے کہیں گردِ ماہ و سال میں گم

اپنے بس میں ہے اب کہ ہو جائیں
نشۂ ہجر یا وصال میں گم
دہر کے آئینے میں ہوں آذر
اپنے ہی عکسِ بے مثال میں گم

احمد مشتاق

چاند اس گھر کے دریچوں کے برابر آیا
دلِ مشتاق ٹھہر جا وہی منظر آیا

میں بہت خوش تھا کڑی دھوپ کے سناٹے میں
کیوں تری یاد کا بادل مرے سر پر آیا

بجھ گئی رونقِ پروانہ تو محفل چمکی
سو گئے اہلِ تمنا تو ستمگر آیا

یار سب جمع ہوئے رات کی خاموشی میں
کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا

عدیمؔ ہاشمی

رختِ سفر یونہی تو نہ بیکار لے چلو
رستہ ہے دھوپ کا، کوئی دیوار لے چلو

طاقت نہیں زباں میں تو لکھ ہی لو دل کی بات
کوئی تو ساتھ صورتِ اظہار لے چلو

دیکھوں تو وہ بدل کے بھلا کیسا ہو گیا
مجھ کو بھی اس کے سامنے اک بار لے چلو

کب تک ندی کی تہہ میں اتارو گے کشتیاں
اب کے تو ہاتھ میں کوئی پتوار لے چلو

پڑتی ہیں دل پہ غم کی سلوٹیں تو کیا
چہرے پہ تو خوشی کے کچھ آثار لے چلو

جتنے بھنور کہو گے، پہن لوں گا جسم پر
اک بار تو ندی کے مجھے پار لے چلو

کچھ بھی نہیں اگر تو ہتھیلی پہ جاں سہی
تحفہ کوئی تو اس کے لیے یار لے چلو!

جنگل میں آئے گا کوئی گاہک کہاں عدیمؔ
بکنا ہے گر تو ساتھ خریدار لے چلو

ریاض مجید

جب اگلے سال یہی وقت آ رہا ہو گا
یہ کون جانتا ہے، کون کس جگہ ہو گا

تو میرے سامنے بیٹھا ہے اور میں سوچتا ہوں
کہ آتے لمحوں میں جینا بھی اک سزا ہو گا

ہم اپنے اپنے بکھیڑوں میں پھنس چکے ہوں گے
نہ تجھ کو میرا، نہ مجھ کو ترا پتا ہو گا

یہی جگہ جہاں ہم آج مل کے بیٹھے ہیں!
اسی جگہ پہ، خدا جانے کل کو کیا ہو گا

یہی چمکتے ہوئے پل، دھواں دھواں ہوں گے
یہی جھمکتا ہوا دل، بجھا بجھا ہو گا

لہو رلائے گا وہ دھوپ چھاؤں کا منظر
نظر اٹھاؤں گا جس سمت جھٹپٹا ہو گا

بچھڑنے والے! تجھے دیکھ دیکھ سوچتا ہوں
تو پھر ملے گا تو کتنا بدل چکا ہو گا

اقبال ساجد

وہ چاند ہے تو عکس بھی پانی میں آئے گا
کردار خود اُبھر کے کہانی میں آئے گا

چڑھتے ہی دھوپ شہر کے کھُل جائینگے کواڑ
جسموں کا راہگذار روانی میں آئے گا

آئینہ ہاتھ میں ہے تو سورج پہ عکس ڈال!
کچھ لطف بھی چراغ رسانی میں آئے گا

دِل میں لگے گی آگ تو سُلگے گی آنکھ بھی
یہ شعلہ خود ہی آپ معانی میں آئے گا

رختِ سفر بھی ہوگا میرے ساتھ شہر میں
صحرا بھی شوقِ نقل مکانی میں آئے گا

پھر آئے گا وہ مجھ سے بچھڑنے کے واسطے
بچپن کا دَور پھر سے جوانی میں آئے گا

کب تک لہُو کے حبس سے گرمائے گا بدن
کب تک اُبال آگ سے پانی میں آئے گا

صُورت تو بھول بیٹھا ہوں آواز یاد ہے
اِک عمر اور ذہن گرانی میں آئے گا

ساجدؔ تو اپنے نام کا کتبہ اُٹھائے پھر
یہ لفظ کب لباسِ معنی میں آئے گا

خالدؔ احمد

بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے نین نشیلے نہ رہے

اشک برسے تو دروں خانۂ جاں سیل گیا
درد چمکا تو در و بام بھی گیلے نہ رہے

پھول سے باس جُدا ، فکر سے احساس جُدا
فرد سے ٹوٹ گئے فرد قبیلے نہ رہے

ٹیس اٹھتی ہے مگر چیخ نہیں ہو پاتی
تیر سے پھینکے ہوئے پتھر بھی نکیلے نہ رہے

موت نے چھین لیا رنگ بھی نم بھی خالدؔ
آنکھ بھی سوکھ گئی ہونٹ بھی نیلے نہ رہے

عاصی گیلانی

قسمت میں حادثہ جو لکھا تھا وہ ہو گیا
میرے وجود میں تو کوئی کرب ہو گیا

وہ پھول ایسا شخص تھا کس درجہ سنگدل!
چُپ چاپ فصلِ خار مرے دل میں بو گیا

اک میں کہ اس کے غم میں برابر کا تھا شریک
اک وہ کہ کھل کے اپنی تباہی پہ رو گیا

سورج نے مجھ کو وقتِ سحر یہ صلہ دیا
نکلا تو میرے جسم میں کرنیں چبھو گیا

نگر شہر کے ہجوم سے راہِ خضر ملی
آیا جو گھر تو بھیڑ میں بچّوں کی کھو گیا

چڑھتے ہی دھوپ رزق کی نکلا تلاش میں
ہوتے ہی شام یاد کے جنگل میں کھو گیا

کل تک تو میرے ساتھ اب کیا بتاؤں میں
کس شہر سے چلا تھا وہ کس دشت کو گیا

آنکھیں کھلیں تو قلب میں بکھرا ہوا تھا نور
اک نیکیوں کا ہاتھ گناہوں کو دھو گیا

بالی جی

دیکھ کتنا نراش منظر ہے
ٹوٹتے پاؤں سامنے گھر ہے
کون پوجا کے پھول لائے گا
زندگی اک اجاڑ مندر ہے
غم کی دہلیز پہ ہوئے چھلنی!
یہ نہ جانا کہ کانچ کا در ہے
کوئی آکر ہمیں پکارے کیوں
کیا کہیں کس جگہ لٹا گھر ہے
اب کسی بات پر نہیں رونا
اپنے سینے میں بو دیا پتھر ہے

———— ✣ ————

مصباح الایمان

جا پہنچا ان کے در پہ میں اک دن نشہ کیے
مت پوچھو، کیسے کیسے وہ جز بز ہوا کیے

جن میں رچی ہوئی تھی محبت کی چاشنی
تو نے وہ دن اے گردشِ ایام کیا کیے

سیرِ جہاں کے واسطے نکلے ہیں گھر سے ہم
اپنے صنم کدے کو سپردِ خدا کیے

محفل میں اپنی پھر سے بلاتے ہو کیوں ہمیں
ایسا ہوا کبھی کہ گئے دن پھرا کیے

کھلتے رہے گلاب چمن در چمن مدام
اور کا کُلِ دراز میں اُن کی سجا کیے

مجھ تک اِک اُن کا خط ہی پہنچتا نہیں کہیں
لاتے ہیں گو خطوط بہت روز ڈاکیے

پائی نہ اُس کی گرد بھی، ہم گرچہ عمر بھر
لیلائے شعر کے لیے مجنوں بنا کیے

رفیق احمد ساقی

ایسا مرے خلوص کا اس پر اثر ملے
نہ جائے چھوڑ کر مجھے آکر اگر ملے

میں جس طرف نکل پڑا اس کی تلاش میں
اپنے ہی پاؤں کے نشاں اس راہ پر ملے

اِس قافلے میں کیا بچا راہزن کے واسطے
یارو ہر اک قدم پہ جسے راہبر ملے

مریخ پر چلو کہ چلو ماہتاب پر!
واں لے چلو ہمیں جہاں اپنی خبر ملے

اِتنی طویل زندگی گزرے گی کس طرح
ہم سوچتے ہیں جب کوئی غم مختصر ملے

وہ چار دن کی برہمی کیا لطف دے گئی
جی چاہتا ہے پھر کبھی وہ رُوٹھ کر ملے

ہم ڈھونڈتے ہیں رونقِ بازار میں جسے
شاید رفیقؔ وہ ہمیں اپنے ہی گھر ملے

منزل رفیقؔ ایک تھی رستے جُدا جُدا
تنہا سفر جو کٹ گیا تو ہم سفر ملے

سرورؔ بارہ بنکوی

اے جنوں کچھ تو کھلے، آخر میں کس منزل میں ہوں
ہوں جوارِ یار میں یا کوچۂ قاتل میں ہوں

پا بہ جولاں اپنے شانوں پر لیے اپنی صلیب
میں سفیرِ حق ہوں لیکن نرغۂ باطل میں ہوں

جشنِ فردا کے تصوّر سے لہو گردش میں ہے
حال میں ہوں اور زندہ اپنے مستقبل میں ہوں

دم بہ خود ہوں اب سرِ مقتل یہ منظر دیکھ کر
میں کہ خود مقتول ہوں لیکن صفِ قاتل میں ہوں

اک زمانہ ہو گیا بچھڑے ہوئے جس سے سرورؔ
آج اُسی کے سامنے ہوں اور بھری محفل میں ہوں

پروین شاکر

بُجھ گئی آنکھ تو پیراہنِ تر کیا لائے
چاہ سے اب مرے یُوسف کی خبر کیا لائے

شب گزارو! وہ ستارہ تو مرا ٹوٹ چُکا
اب دمِ صبح دُعاؤں میں اثر کیا لائے

جب مسافر کا ارادہ ہی بھٹکنے کا ہوا
اِک چراغ اور سرِ راہ گزر کیا لائے

رات ہم خانہ خرابوں کا بھرم رکھ لیتی
روشنی رہنے میں مہمان کو گھر کیا لائے

راہ پوُچھے کوئی رہبر نہ ارادہ پرکھے
بس یہی دھیان کہ ہم رختِ سفر کیا لائے

شہر میں سانپ جب انسانوں سے زائد ہوں
آدمی اپنے سوا ذہن میں ڈر کیا لائے

اختر ہوشیارپوری

آنکھیں بھی کھلی رکھنا، شمع بھی جلا رکھنا
شاید میں پلٹ آؤں، دروازے کو وا رکھنا

جو چیز جہاں پر ہے، چاہو تو اُٹھا لینا!
اک سایہ مگر پھر بھی چوکھٹ پہ کھڑا رکھنا

خورشید کی کرنیں بھی آئیں گی قدم لینے
پرچم گُل و لالہ کا ہاتھوں میں اُٹھا رکھنا

نظریں نہ بھلا بیٹھیں، جی سے نہ اُتر جاؤں
دیوار سے تم میری تصویر لگا رکھنا

اک آخری بات اخترؔ یاروں سے بھی کہنی ہے
جو حرفِ دُعا پاؤ، ہونٹوں پہ سجا رکھنا

فہمیدہ غزلؔ

کشتیٔ دِل بھی تو غرقاب ہوئی جاتی ہے
ہستیٔ موج تہِ آب ہوئی جاتی ہے

جانے کس آس پہ قائم ہے ہماری دُنیا
جب وفا اور بھی نایاب ہوئی جاتی ہے

ہم ہیں خاموش کسی شام اُداسی کی طرح
زندگی درد کا مضراب ہوئی جاتی ہے

شامِ غم چھانے لگی آج مری خوشیوں پر
اب خوشی اور بھی کمیاب ہوئی جاتی ہے

لذّتِ وصل شبِ ہجر سے قائم ہے غزلؔ
اور شبِ ہجر ہی نایاب ہوئی جاتی ہے

اکبر حیدر آبادی

خزاں کے دور میں رنگیں گلستانوں پہ کیا گزری
سحر کے وقت خوابیدہ شبستانوں پہ کیا گزری

صراحی پر مئے و مینا پہ پیمانوں پہ کیا گزری
مزاجِ رند جب بلا نو پیمانوں پہ کیا گزری

اسیروں کی بغاوت سے ستم رانوں پہ کیا گزری
ہوا جب شور زنداں میں تو ایوانوں پہ کیا گزری

بہت دلکش سہی تیرے لیے منظر بہاروں کا
مگر تجھ کو خبر بھی ہے کہ دیوانوں پہ کیا گزری

زبانِ حال سے کہتا ہے ہر اک تارِ پیراہن!
جنوں کے دورِ وحشت میں گریبانوں پہ کیا گزری

قفس سے چھوٹ کر جب آشیانہ جلتا ہوا پایا
نہ پوچھ اے ہمنشیں اس وقت رہانوں پہ کیا گزری

تمہارے غم سے جب اپنوں کی آنکھیں نم نہیں اکبر
تو پھر یہ پوچھتے کیوں ہو کہ بیگانوں پہ کیا گزری

مولانا ماہر القادری

گلُ و بُلبُل کی یکجائی بھی ہو گی!
کبھی میری پذیرائی بھی ہو گی

یہ سعیِ احتیاط و ضبط کب تک
محبّت ہے تو رُسوائی بھی ہو گی

حقیقت، جو ہے تخیّل و تصوّر
کسی کو وہ نظر آئی بھی ہو گی!

ابھی تنہائیوں کے مرحلے ہیں!
کسی دِن بزم آرائی بھی ہو گی

جُنوں بے دانش و حکمت ہو گا
سمندر ہے تو گہرائی بھی ہو گی

سردار شہزاد نواز

لکھتا ہوں کوئی شعر میں جب خونِ جگر سے
پتھر بھی پگھلتے ہوئے پاتا ہوں اثر سے

شاید کبھی اپنایا تھا میں نے بھی کسی کو
جاتا نہیں اک عکس سا کیوں قلب نظر سے

بس اتنی خبر ہے کہ ہمیں کر گیا برباد
آیا تھا کوئی شخص خدا جانے کدھر سے

دو چار برس میرے بھی گزرے ہیں وہاں پر
وابستہ ہیں یادیں مری داتا کے نگر سے

یہ حکم ہے اس بادشاہِ حسن کا یارو
دیوانوں سے کہہ دو کہ وہ گزریں ادھر سے

ہر رنگ میں ہر حال میں کیوں دیکھے ترا روپ
چھپ جائیے یہ گستاخ ہیں کہتا ہوں قمر سے

شہزاد بڑی دیر کے بعد آنکھ کھلی ہے
اُجڑا ہوا نکلا ہوں محبت کے نگر سے

عابدہ جیلانی

ہم بھٹک کر رہ نہ جائیں راستوں کے درمیاں
فاصلے پھیلے ہوئے ہیں منزلوں کے درمیاں

ہم تو اس سے قبل بھی کر دیتے ترکِ زندگی
کیا کریں گے بٹ گئے ہیں چاہتوں کے درمیاں

دشمنوں کو بخش دیتے ہیں خلوص و مہر سے
ہم بھلا کیا جی سکیں گے نفرتوں کے درمیاں

کوئی شاید منتظر ہے میرے آنے کا ابھی
کانچ کے ٹکڑے بچھے ہیں راستوں کے درمیاں

رائیگاں جاتی ہے محنت بے اثر ہوتی ہے آہ
ہم کھلونا بن گئے ہیں قسمتوں کے درمیاں

دل بھی آمادہ ہے کچھ کچھ اب جدائی کیلئے
رنجشیں اتنی ملی ہیں قربتوں کے درمیاں

جانے کتنی مختصر تھی آرزوئے زندگی
ہم تو تنہا رہ گئے ہیں دوستوں کے درمیاں

اِعتبار ساجدؔ

اِسی لیے سَر جُھکا جُھکا کے دُعائیں دیتی تھیں ہم کو مائیں
کہ ہوش آئے تو ہوش کھو دیں جوان ہوں تو الم کمائیں
بستے شہروں کی چمنیوں کو دُھواں عطا کر رہے ہیں بھائی!
اُجاڑ صحنوں میں جل رہی ہیں جوان بہنوں کی آتمائیں!
فضا کے مقتل میں جا بجا منتظر صلیبوں سے بچتے بچتے
نِڈھال تن اور شکستہ رُوحیں سمیٹ کر ہم گھروں کو آئیں
تحفّظِ شمعِ ذات کیسا کہ اب ہے رنگِ حیات ایسا
بدن کی مٹی بکھیر دیں گی یہ رزق کی بے بصر ہوائیں
شریکِ رنجِ سفر نہ ہوتے وہ ہات گو ہمسفر نہ ہوتے!
امام ضامن ہی باندھ دیتے تو دُور ہو جاتیں سب بلائیں
یہ مہلتِ آرزو تو ساجدؔ قلیل پائی ہے زندگی سے
کہاں کہاں بانٹتے پھریں غم کسے کسے دھڑکنیں سُنائیں

نصرت ادیب ہاشمی

چاندنی سے پُرکشش ہے تیرہ سامانی مجھے!
رونقوں سے بیش قیمت تر ہے ویرانی مجھے!

آج کل ہوتی ہیں جو اُن کی نگاہوں سے عیاں!
جان سے پیاری لگی ہے وہ پریشانی مجھے

آگہی کی منزلوں کو کیسے چھو سکتی تھی میں!
لے گئی اکثر وہاں پر میری نادانی مجھے

دیکھ کر چہروں پہ سُرخی اور عرقِ انفعال
اِک جگہ اچھے لگے ہیں آگ اور پانی مجھے

آستیں میں ناگ رکھتی ہیں مُعطّر صحبتیں!
دوستی اب کے لگی ہے رات کی رانی مجھے

ڈاکٹر جب بیچتے ہیں خواب آور گولیاں!
شب دریدہ چشم کی چبھتی ہے ارزانی مجھے

اِتنی بے دردی سے ٹوٹا ہے سماعت کا بھرم
اب تو اپنوں کی صدا لگتی ہے بیگانی مجھے!

وُہ تو کہتا تھا کہ نصرت لوٹ آؤں گا ضرور
کب تلک کرنی پڑے گی وقت گردانی مجھے

نکہت مشرف

تپتے صحرا میں بگولوں کا سفر دیکھا ہے
وسعتِ دشت کو یوں زیر و زبر دیکھا ہے

دل کی آہوں نے محبّت کا اثر دیکھا ہے
جب سے میں نے نرا اُجڑا ہوا گھر دیکھا ہے

ہو گئی دِل میں مرے کیسی قیامت برپا
جب سے محفل میں اُسے ایک نظر دیکھا ہے

یُوں تو دُنیا میں حسیں اور بھی ہونگے لیکن
کیا کبھی تم نے مرا رشکِ قمر دیکھا ہے

جس کے ہنسنے پہ بہاروں کا گماں ہوتا تھا
تیری محفل میں اُسے دیدۂ تر دیکھا ہے

اُس کو ساحل سے بھلا ہوں گی اُمیدیں کیسی
جس نے کشتی کے مقدّر میں بھنور دیکھا ہے

جس کا ہو ذاتِ الٰہی پہ یقینِ کامل
ہر مصیبت میں اُسے سینہ سپر دیکھا ہے

چارسُو نور کی چادر تھی فضا پر جیسے
جلوہ آنکھوں نے مری تا بہ سحر دیکھا ہے

میری آنکھوں میں نہیں تاب کہ دیکھوں نکہتؔ
اپنی محرومیاں بکھری ہیں، جدھر دیکھا ہے!

شعروں کی ڈکشنری

شعرستان

مختلف عنوانات کے تحت ہزاروں اشعار کا خوبصورت انتخاب

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیبؔ رامپوری

عائشہ نکہت

تھی آرزو پھولوں کی مگر پائے ہیں پتھر
کچھ لوگ مقدر میں لکھا لائے ہیں پتھر

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ دِوانے
جس سمت بھی پہنچے ہیں وہیں آئے ہیں پتھر

اے اہلِ ہنر فن کی تمہیں داد ملے گی
کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ منگوائے ہیں پتھر

اس شہرِ جفا کی یہ روایت ہے عزیزو
جس نے کبھی حق بات کہی کھائے ہیں پتھر

اب غم نہیں اس کا انہیں مِل نہ سکا کچھ
ہم شہرِ تمنّا سے اُٹھا لائے ہیں پتھر

کیوں آپ کو اصرار ہے اُلفت پہ ہماری
بس آپ سمجھ لیں کہ ہمیں بھائے ہیں پتھر

جس بار کو ہنس کر دلِ نازک نے اُٹھایا
وُہ بوجھ اُٹھاتے ہوئے گھبرائے ہیں پتھر

کیا اور شکایت ہو کسی جبر کی نکہتؔ
اِس زیست نے ہم پہ سدا برسائے ہیں پتھر

نوید بخاری عرشی

مرے من کے چھپّر کھٹ میں مرے دلدار کی صورت
بہت رنگین بہت چنچل گُل و گلزار کی صورت
ذرا دم لے تو اے ہمدم، بنوں میں دُھول چہرے کی
بہت رو تدا کیسے ہو پاؤں میں غبار کی صورت
جیسے درماندہ رہرو کی صدا سمجھے ہوا اے ساقی
دِل بے کل ہے جو پاتا نہیں اظہار کی صورت
تری چشم کرم ہمہ ہے، کبھی نازاں کبھی نالاں!
کبھی اقرار کی صورت، کبھی انکار کی صورت
خزائیں پُوچھتی پھرتی ہیں لوگوں سے پتہ میرا
کہ کھِلتے ہیں مرے دل میں گلاب اشعار کی صورت

افتخار جبیں

جانے والے تری یادوں کو بھلا کر دیکھا
لوحِ دل سے ترا ہر نقش مٹا کر دیکھا

ساری دُنیا کو نظر آنے لگے تیرے نقوش
جب بھی آنکھوں میں کبھی تجھ کو چھپا کر دیکھا

تیرے جاتے ہی خفا ہو گئی دُنیا ساری
بارہا ہم نے یہ احساس مٹا کر دیکھا

سنگ دل میری وفاؤں کا تو قائل نہ ہوا
زخم ہر بار نیا تُو نے لگا کر دیکھا

راس کیوں دوستی آئی نہ کسی کی ہم کو
ہم نے ہر طور سے پیمان نبھا کر دیکھا

بھُول بھی جاؤ زمانے کے ستم اب تو جبیںؔ
ہنسنے والوں نے تمہیں کتنا ستا کر دیکھا

راغب مراد آبادی

گلستاں اُجڑا ، خیالِ گلستاں آیا تو کیا
اب تصوّر میں سکونِ آشیاں آیا تو کیا

کاروانِ عقل ، نذرِ گمرہی جب ہو چکا
کوئی خضرِ راہ و میرِ کارواں آیا تو کیا

ہو چکی جب زندگی، آسودۂ آغوشِ مرگ
مہرباں آیا تو کیا ، نامہرباں آیا تو کیا

کھو چکے جب ہم ، متاعِ شوق واحساسِ جمال
اب کوئی سروِ رواں ، ابرو کماں آیا تو کیا

اب کہاں سے لاؤں ، وہ بیتابیٔ شوقِ نیاز
یاد اگر مجھ کو ، کسی کا آستاں آیا تو کیا

آتشِ ذوقِ پرستش ، دِل میں ٹھنڈی ہو چکی
اب میسّر سایۂ زلفِ بتاں آیا تو کیا

صدا لکھنوی

اچھا جو کہہ چکے انہیں سارے جہاں سے ہم
اُن کا گِلا کریں تو کریں کس زباں سے ہم

نیرنگیاں یہ کہتی ہیں اب حُسن و عشق کی!
باتیں زمیں سے آپ کریں آسماں سے ہم

اللہ زندگی کی بھی مجبوریاں ہیں خُوب!
لپٹے ہوئے ہیں دامنِ عمرِ رواں سے ہم

انداز کہہ رہا ہے یہ اپنی اُڑان کا!
آزاد ہیں خیالِ غمِ آشیاں سے ہم

اِس طرح حسن و عشق ازل سے ہیں ساتھ ساتھ
وابستہ جیسے گردشِ دورِ جہاں سے ہم

تم نے کسی سے جو بھی کہا اس کا ذکر کیا
سُننا وہ چاہتے ہیں تمہاری زباں سے ہم

پاکیزگی کا اپنی ہے اللہ! یہ غرور
اُترے ہیں جیسے آج صدا آسماں سے ہم

اُستاد قمر جلالوی مرحوم

کب میرا نشیمن اہلِ چمن گلشن میں گوارا کرتے ہیں
غنچے اپنی آوازوں میں۔ بجلی کو پکارا کرتے ہیں!

اب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبت واپس لو
جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں

جاتی ہوئی میت دیکھ کے بھی اللہ تم اُٹھ کے آ نہ سکے
دو چار قدم تو دُشمن بھی تکلیف گوارا کرتے ہیں!

بے وجہ نہ جانے کیوں ضد ہے انکو شبِ فُرقت والوں سے
وہ رات بڑھا دینے کے لیے گیسو کو سنوارا کرتے ہیں

پوچھو نہ عرق رخساروں سے رنگینیٔ حسُن کو بڑھنے دو
سُنتے ہیں کہ شبنم کے قطرے پھولوں کو نکھارا کرتے ہیں

کچھ حسن و عشق میں فرق نہیں ہے بھی فقط رسوائی کا
تم ہو کر گوارا کر نہ سکے ہم ہیں کہ گوارا کرتے ہیں

تاروں کی بہاروں میں بھی قمر تم افسردہ سے رہتے ہو
پھولوں کو دیکھو کانٹوں میں ہنس ہنس کے گزارہ کرتے ہیں

ابنِ حسن عثمان آبادی

کس نے دستک دی ہے بولو کون یہ در پر آیا ہے
مجھ پر تھا اِک خواب کا عالم کس نے آن جگایا ہے

جس نے برسوں چاہا ہم کو اس نے ہی ٹھکرایا ہے
اس کو اب میں کیسے چاہوں وہ جو شخص پرایا ہے

میں کہ دل کا باغی یارو! انجانی سی راہوں پر
سوچ رہا ہوں کیسے پہنچا کون یہاں تک لایا ہے

میری آنکھیں سرخ ہیں لیکن میں نے مطلق پی ہی نہیں
میرے بدن کا خون ہے یہ جو آنکھوں میں کھنچ آیا ہے

گھر کی دیواروں پہ رقصاں شعلے کتنے ہنگاموں کے
آگ بڑھی تو سب سے پہلے اپنا آپ بچایا ہے

انسانوں کی بھیڑ میں لوگو کس کو اپنا کہتے ہم
وہ جو ساتھی بچپن کا تھا اس نے بھی تڑپایا ہے

بزمِ سخن میں سونی سونی چاروں اور اداسی ہے
ابنِ حسن نے شعر سنا کر محفل کو گرمایا ہے

شمس الغنی

ملا تھا کل جو سرِ راہ چاہتوں کی طرح
ٹھہر گیا مری آنکھوں میں وحشتوں کی طرح

جو دِل کی سمت بڑھا تھا محبّتوں کی طرح
سمٹ کے رہ گیا سینے میں نفرتوں کی طرح

اِسے گمان کر چاہا اُسے زمانے نے
عزیز سب کو تھا لیکن ضرورتوں کی طرح

جو جنگ اس نے لڑی بے اصول و بے مقصد
کسی کے کام نہ آیا بغاوتوں کی طرح

کب آشنائے محبّت تھا کر گیا پھر بھی
وہ میرے دِل پہ حکومت محبّتوں کی طرح

ہر ایک موڑ پر ہر زندگی کی منزل پر
وہ یاد آئے گا لیکن شکایتوں کی طرح

محبّتوں سے بڑے نفرتوں کے رشتے ہیں
وُہ مجھ میں زندہ رہے گا عداوتوں کی طرح

سیّد نجم الدین ظفؔر

واسطہ کچھ بھی نہیں اب صبح کی تنویر سے
شامِ غم کا واسطہ ہے اب مری تقدیر سے

کیوں مقدّر میں مرے دُکھ درد ہی لکھتا رہا!
ایک دن پوچھوں گا جا کر کاتبِ تقدیر سے

ناصحو! مجھ کو نصیحت سے بھلا کیا فائدہ؟
تنگ آتا جا رہا ہوں ایک ہی تقریر سے

عزم لے کر آئے تھے میری رہائی کا مگر
اُنگلیاں اُلجھی ہوئی تھیں زلف کی زنجیر سے

اب مری پہلی سی حالت اور وہ وحشت نہیں
دل بہل جاتا ہے کچھ کچھ اب تری تصویر سے

دل کے زخموں کو ظفؔر اس طرح تو چاپا نہ کرو
خونِ دل رِستا نظر آ جائے گا تحریر سے

وارث رضا

کب سے میں دریچے میں کھڑا دیکھ رہا ہوں
گلیوں میں ہے اِک شور بپا دیکھ رہا ہوں!

ہر ایک جبیں پر ہے کدورت کی عبارت
ہر لہجہ ہی اب زہر بھرا دیکھ رہا ہوں

خاموش ہیں کیوں شہرِ نگاراں کے در و بام
کیوں جذبِ وفا دِل میں دبا دیکھ رہا ہوں

ہر موڑ پہ دُنیا کو بدلتے ہوئے دیکھا
ہر گام پہ اِک رنگ نیا دیکھ رہا ہوں

کل تک نہ تھے جو طرزِ تکلّم سے بھی آگاہ
میں آج اُنہیں شعلہ نوا دیکھ رہا ہوں

جو اصل ہے تُو مجھ کو دکھائی نہیں دیتا
میں تجھ کو ترے قد سے بڑا دیکھ رہا ہوں

حالات کے دم توڑتے دورا ہے پہ وارث
کِس سمت کو چلتی ہے ہوا دیکھ رہا ہوں!

عبدالقدوس تابش

زندگی کو اس قدر رنگیں بنانا چاہیئے
شدّتِ آلام میں بھی مُسکرانا چاہیئے

جس میں ہر مجبُور کی تسکین کا سامان ہو
ایک ایسی بھی الگ دُنیا بسانا چاہیئے

میں تو خود پروردۂ طوفاں ہوں اے موجِ بلا
مجھ سے تو خود تجھ کو ہی دامن بچانا چاہیئے

یورشِ طوفاں سے جو ڈرتے ہیں ساحل کے قریب
اُن کی کشتی کو وہیں پر ڈوب جانا چاہیئے

کچھ نہیں تقدیر میں اپنی مگر دستِ جنُوں
اُن کا دامن دیکھ ہاتھوں سے نہ جانا چاہیئے

غیرتِ ضبطِ اَلم یہ کیا ہوا وہ رو دیئے
اُن کو میرے حال پر تو مُسکرانا چاہیئے

کہہ رہی ہیں مجھ سے تابش میرے دِل کی دھڑکنیں
آج وہ آئیں گے شاید اُن کو آنا چاہیئے

سیّد تصوّر حسین تصوّر

دَرد میں ڈوبی ہوئی اِک داستاں ہے زندگی
لڑکھڑاتی حسرتوں کا کارواں ہے زندگی

ہر گھڑی ہے تلخیوں کی دُھول چہرے پر اَٹی
آج کے اِنسان پر کِتنی گراں ہے زندگی

کِس طرح ہموار ہوں گے دَرد کے یہ فاصلے!
جب سکونِ جاوداں کے درمیاں ہے زندگی

جَل رہے ہیں نفرتوں کی آگ میں اہلِ وفا
اُلفتوں کی لاش پر ماتم کناں ہے زندگی

لُٹ رہا ہے آج اہلِ علم و فن کا بھی وجُود
اِنسانیّت کے نام پر بارِ گراں، ہے زندگی

جذبۂ احساس کے فقدان کا ماتم نہ کر
دردِ دِل کے واسطے مِلتی کہاں ہے زندگی

انور شعور

خدا کا شکر سہارے بغیر بیت گئی!
ہماری عمر تمہارے بغیر بیت گئی

جو بات اُس کے اشارے پہ بیتنی ہم پر
وہ دل پہ اُس کے اشارے بغیر بیت گئی

ہوئی نہ شمع فروزاں تو آنکھ کیا جلتی
شبِ فراق ستارے بغیر بیت گئی

وہ زندگی جو گذارے نہیں گزرتی تھی!
ترے طفیل گزارے بغیر بیت گئی

نہ بیتتی تھی کبھی جس کی چاندرات، اُس کی
سُہاگ رات ہمارے بغیر بیت گئی

شعورؔ تیز رہی زندگی کی دوڑ اتنی
کہ ہار جیت شمارے بغیر بیت گئی

طارق عزیز فلم اسٹار

کالے حرف کتاباں دے — نقشے دین عذاباں دے
سب لوکوں پیارے ہوندے نیں — منتظر اپنے خواباں دے
ہُن تک چہرے زخمی نیں — گُہرے سُرخ گلُاباں دے
بعد ترے کی بیت گئی — پچھ ناں حال خراباں دے
تیرے بعد بے برکت ہوئے — نشے تیز شراباں دے
کریں حفاظت میری مولیٰ!
موسم آئے ثواباں دے

○

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے
ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے

ثاقب زیروی

رات کو پچھلے پہر جب اشک برساتا ہے دل
اشک کے ہر ایک قطرے میں نظر آتا ہے دل
صبح تک شاید نہ میں ہوں اور نہ یہ سازِ حیات
ڈوبتے جاتے ہیں تارے بیٹھتا جاتا ہے دل

پُرتبسم آفریں چہروں سے کھاتے ہیں فریب
جب کوئی بے ساختہ ہنستا ہے بھر آتا ہے دل
حُسن واقف ہے نہ اہلِ عشق کو اس کی خبر
کس طرح اک اجنبی صُورت پہ آ جاتا ہے دل

ہر قدم پر مشکلیں ہیں عشقِ غیرت مند کو
جرم کرتی ہیں نگاہیں اور شرماتا ہے دل
عشق کی کشتی کا ساحل سے بھلا کیا واسطہ
کھاتا جاتا ہے تھپیڑے جھومتا جاتا ہے دل

عشق میں ثاقب نگاہیں تو عبث بدنام ہیں
ہم نے دیکھا ہے نظر سے بیشتر آتا ہے دل

○

آنکھوں سے لاکھ خون کے طوفاں اُٹھائیے
لیکن نہ اہلِ دہر کے احساں اُٹھائیے

اُلفت کی قید و بند پہ آزادیاں نثار
رہ کر قفس میں لطفِ بہاراں اُٹھائیے

پروانہ بھی شہید گُل و غنچہ بھی شہید
کس کس جگہ سے خاکِ شہیداں اُٹھائیے

اِک بار اور دیجئے اذنِ حیاتِ شوق
اِک بار پھر نگاہِ پشیماں اُٹھائیے

ہر موسمِ بہار گزرتا ہے اشک بار
کس حوصلہ پہ نازِ گلستاں اُٹھائیے

آپ آنسوؤں میں غرق نظر آئیں گے مجھے
کہئے نہ مجھ سے دیدۂ گریاں اُٹھائیے

ثاقبؔ کی ہست و بُود کا ہوتا ہے فیصلہ
ہاں پھر نگاہِ حشر بداماں اُٹھائیے

حبیب جالب

محبّت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اِک جہاں چھوڑ آئے!
پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے
وہ سبزہ وہ دریا وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے
حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رُت وہ سماں چھوڑ آئے
بہت دُور ہم آ گئے اُس گلی سے
بہت دُور وہ آستاں چھوڑ آئے
بہت مہرباں تھیں وہ گلیوں کی راہیں
مگر ہم اُنہیں مہرباں چھوڑ آئے
بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں!
نشیمن سرِ گلستاں چھوڑ آئے
یہ اعجاز ہے حُسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

چلے آئے اُن رہگذاروں سے جالبؔ
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

اردو کے مستند شعرا و شاعرات کے گلہائے عقیدت بحضور سرورِ کونین

گلدستۂ نعت

ترتیب و پیشکش
خاکِ درِ رسولؐ
نجیب رامپوری

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹیڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
NEW DELHI-110002

احسان دانش

زندگی گزرتی ہے یُوں کبھی کبھی تنہا
جس طرح مقابر میں شب کی خامشی تنہا

ہے چمن حقیقت میں ایک شہرِ تنہائی
خار کی خلش تنہا، پھول کی ہنسی تنہا

اُن کی جاں نوازی سے دِل ابھی دھڑکتا ہے
آنسوؤں کا دریا ہے ورنہ چاندنی تنہا

اِک طویل مدّت سے ہے کشیدگی لیکن
اب بھی آ نکلتے ہیں وُہ کبھی کبھی تنہا

دیکھئے تو برپا ہیں ہر قدم پہ ہنگامے
سوچیئے تو دُنیا میں ہے ہر آدمی تنہا

جانے دِل کی دھڑکن میں اعتدال کیا آئے
سامنے سے گزرے ہیں وُہ ابھی ابھی تنہا

خلق اور تعلق میں فاصلوں کی حد بھی ہو
روشنی کہاں تک دے شمعِ زندگی تنہا

○

○

جانبِ کوئے نگاراں جو قدم اُٹھتے ہیں
پیشوائی کے لیے دیر و حرم اُٹھتے ہیں!

ہیں فقط اہلِ نظر واقفِ آدابِ جمال
کم سوادوں سے کہاں عشق کے غم اُٹھتے ہیں

نہ شفق ہے نہ دُھندلکا، نہ تجلّی، نہ غبار
کوئی منزل کا نشاں ہو تو قدم اُٹھتے ہیں!

ہے وفاؤں کا بہت زعم ہمیں بھی لیکن
دام اس جنس کے بازار میں کم اُٹھتے ہیں

بیٹھتے ہیں کبھی چھالے کی طرح اشک فشاں
درد کی طرح چمک کر کبھی ہم اُٹھتے ہیں

دِل کی دھڑکن ہمیں پہروں نہیں اُٹھنے دیتی
گاہے ماہے انہیں خط لکھ کے جو ہم اُٹھتے ہیں

ایک پیمانۂ ہمّت ہے وفا بھی دانشؔ!
عشق جتنا ہو بس اُتنے ہی ستم اُٹھتے ہیں

○

حُسن کی طالب نگاہیں دِل تمنّا آشنا
زندگی لائی ہے اپنے ساتھ کیا کیا آشنا

حسنِ گل میں ہو کہ شعلے میں تڑپ اُٹھتا ہے دل
تم نے باندھا ہے مرے دامن سے اچھا آشنا

روز بن جاتا ہے اُن کا حسن موضوعِ کلام
اک قیامت روز کر دیتے ہیں برپا آشنا

خواب ہو کر رہ گئی ہیں کیسی کیسی صحبتیں
داغِ فرقت دے گیا ہے کیسا کیسا آشنا

جانے کتنے دوست اُس محفل میں ہیں کتنے حریف
ہم مگر اُن کی طبیعت سے ہیں تنہا آشنا

اُن کے حلقے میں مری بے تابیوں پر تبصرے
اور اُس دہلیز سے میں آج تک نا آشنا

کس طرف جائیں کہاں نکلیں کہ تم رسوا نہ ہو
ہم تو دیوانے ہیں دیوانوں سے دنیا آشنا

حشر سے ڈرتے ہو دانش بزمِ دنیا سے ڈرو
نفسی نفسی ہے یہاں بھی کون کس کا آشنا

ثریاؔ زیبا

مجھ اسیر دردِ غم کا ہے یہ مختصر فسانہ
کبھی گردشِ مقدّر کبھی گردشِ زمانہ
کبھی بجلیوں کی یورشں کبھی گردشِ زمانہ
اُدھر آفتیں ہزاروں اِدھر ایک آشیانہ

مری چشمِ تر نے اکثر مرا حالِ دل سُنایا
کوئی اشکِ خوں جو ٹپکا وہی بن گیا فسانہ
سرِ چرخ بجلیوں کی یہ تڑپ ہے اک قیامت
کہ لرز لرز گئی ہے مری شاخِ آشیانہ

مرے دِل کا یہ مقدّر کہ ازل کے دن سے ہے یہ
ترے دَرد کا ٹھکانہ ترے تیر کا نشانہ
مجھے آج تک قفس میں کبھی یاد آرہے ہیں
وہ بہار کا زمانہ وہ چمن وہ آشیانہ

نہ خیال اُس کو زیبا نہ ملال اس کو زیبا
اُسے ہم سنائیں کیونکر ترے دَرد کا فسانہ

طفیل ہوشیارپوری

تُو سُرورِ غزل تُو خمارِ غزل
تیری ہستی ہے پروردگارِ غزل

تو حقیقت میں ہے نظم کی آبرو
تیرے دم سے ہے قائم وقارِ غزل

تیری اِک اِک نظر جانِ شعر و سُخن
تیری اِک اِک ادا رازدارِ غزل

نُطق ہے تیرا سرچشمۂ نغمگی!
خامشی ہے تیری پردہ دارِ غزل

تیرے گیسُو فسانوں کا اِک سلسلہ
عارض و لب تیرے لالہ زارِ غزل

تیری نظروں میں آباد ہیں میکدے
تیری آنکھوں میں رقصاں بہارِ غزل

تیرے پرتو سے اشعار میں زندگی
تیرا جلوہ ہے آئینہ دارِ غزل

حُسن ڈھلتا نہ پیکر میں تیرے اگر
کِس کو ہوتا بھلا اعتبارِ غزل

دیکھ ساغر بکف فصلِ گُل آ گئی ہے
رقص کر رقص اے شہر یارِ غزل
دِل میں تیری محبت ہے یوں موجزن
نغمہ ہو جس طرح ہمکنارِ غزل

ہے عالمِ حیرت بھی عجب عالمِ حیرت
بیٹھے ہیں تو بیٹھے ہیں کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں

قطب الدین فصیح ابن سائل

اِن آنکھوں میں اگر سُرمے کی اِک تحریر بن جاتی
تو میرے دِل جگر کے واسطے، وُہ تیر بن جاتی

الٰہی اُن سے ملنے کی، کوئی تدبیر بن جاتی
تو ممکن تھا، میری بگڑی ہوئی تقدیر بن جاتی!

اضافہ۔ اور ہو جاتا سُرور وکیف و مستی میں
اگر۔ ہر جام پہ ساقی۔ تری تصویر۔ بن جاتی

نہ جاتا سوئے صحرا۔ چھوڑ کر زنداں تِرا وحشی
بہار آنے سے، کچھ پہلے۔ اگر زنجیر بن جاتی

یہاں عشق میں لیتا نہ کوئی نام شیریں کا!
ترے ہاتھوں اگر، فرہاد۔ جُوئے شِیر بن جاتی!

چمن کو۔ چھوڑ آئی عندلیب۔ اچھا کیا ورنہ
رگِ گُل۔ فصلِ گُل میں حلقۂ زنجیر بن جاتی

ارادہ تُو نے اپنا ترک۔ ناحق کر دیا۔ قاتل
جو کچھ بنتی، مرے دم پہ، تہہِ شمشیر۔ بن جاتی

نہ آئے۔ ابنِ سائل کی لحد پر فاتحہ پڑھنے
پسِ مُردن۔ وگرنہ خاک، دامن گیر بن جاتی

سیّد قاسم رضوی

یہ ستم نہیں کرم ہے کرو خنجر آزمائی!
مرے زخم بھر نہ جائیں مرے درد کی دہائی

وہ بدیس گھر سے اچھا کہ جہاں بسے زلیخا
مرا شہر شہرِ یوسف، یہاں کون کس کا بھائی

مجھے بے گناہیوں پر تری دوزخیں گوارہ
ترے خُلد اگر ہیں یارب صلہائے پارسائی

مرا جام مے سلامت تجھے ہر گنہ مبارک
ترا زہد اگر ہے زاہد ترا کاسۂ گدائی

تری صنعتوں کی وُقعت مری قدر دانیوں سے
ہے اُدھر تری خدائی تو اِدھر مری خُدائی

ہے وجود ترا ثابت مری جستجو سے یارب
مری بندگی سے قائم تری شانِ کبریائی

رلیا ہے حساب قاسمؔ دیا انگلیوں پہ گن کر
یہ وظیفۂ عبادت ہے کہ قرض کی ادائی

○

مثالِ سرو ہی اچھا بلند سر ہونا
کہ سرنگونی ہے ممنونِ برگ و بر ہونا

بہار پر ہے چتوں اور بہار، رُوبہ خزاں
نہ آیا ذوق سے فطرت کو بہرہ ور ہونا

فضا ہواؤں سے خالی کشش زمیں کی شدید
وبالِ دوش ہے بازو پہ بال و پر ہونا

ہم اور گردشِ سیّارہ گاں کی پابندی
جو شام کو بھی سمجھتے رہے سحر ہونا

یہ آدمی ہے کہ خونِ آدمی کا پیتا ہے
اس آدمی سے تو بہتر ہے جانور ہونا

بجائے غم کو بھلانے کے خود کو کیوں نہ بھلائیں
کہ سر کا دوش پہ ہونا ہے دردِ سر ہونا

بنا سکے نہ مُراِک دَر کا سنگِ در قاسمؔ
مُرا ایک در سے اُٹھانا تھا در بدر ہونا

قمر میرٹھی

ہو گیا جو بھی تری شوخ نظر سے آگاہ
ہو گیا دہر کے ہر فتنہ و شر سے آگاہ

محفلِ انجم و مہتاب سجائے نہ کبھی
شام ہو جائے جو ہنگامِ سحر سے آگاہ

یوں نہ رہ رہ کے مجھے تم سرِ محفل دیکھو
لوگ ہوتے ہیں محبت کی نظر سے آگاہ

لگ گئی آگ بلا سے جو نشیمن کو مرے
اہلِ گلشن تو ہوئے برق و شرر سے آگاہ

چھوڑ جاتے جو نہ ہم نقشِ کفِ پا اپنے
کوئی ہوتا تو نہ تری راہ گذر سے آگاہ

آ کے میخانے میں ساغر جو طلب کرتے ہیں
نظر آتے نہیں ساقی کی نظر سے آگاہ

راہِ ہستی میں قدم رکھتے نہ بھولے سے قمرؔ
ہم اگر ہوتے صعوباتِ سفر سے آگاہ

○

بدلی غم و اندوہ کی ہے چھائی ہوئی سی
از خود ہے طبیعت مری گھبرائی ہوئی سی

قائل ہے زمانہ تری بے باک نظر کا
ملتی ہے مگر مجھ سے تو شرمائی ہوئی سی

دیکھا ہے اُنہیں پہلے پہل حشر میں لیکن!
صورت نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی!

غنچہ جو سرِ شاخ چمن میں کوئی چٹکا
دیکھی ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

مدت ہوئی گزرے تھے وہ دل سے، مگر اب تک
اک برق نگاہوں میں ہے لہرائی ہوئی سی

اس طرح تری بزم میں خاموش کھڑا ہوں
جس طرح کوئی لاش ہو کفنائی ہوئی سی

کیا خاک اثر ہو قمرؔ اُن پر مرے غم کا
فریاد بھی ہے اپنی تو دُہرائی ہوئی سی

کوثر نیازی

اپنوں کی شکایت ہے نہ غیروں کا گِلا ہے
ہر حال میں خوش ہوں کہ یہی اُس کی رضا ہے
اس دَورِ زبوں کار میں کہتا ہوں "خدا ہے"
مجھ بندۂ عاجز کی فقط اِتنی خطا ہے
سینے میں محبّت ہے نہ آنکھوں میں حیا ہے
ہر شخص یہاں شیفتۂ کذب و ریا ہے!
بدلی ہوئی اس دن سے زمانے کی ہَوا ہے
جس روز سے وہ جانِ وفا مجھ سے خفا ہے
کیا طالعِ بیدار ہے کیا بختِ رسا ہے
کہتے ہیں مجھے لوگ یہ اس دَر کا گدا ہے
ہر رہزنِ مشتاق جنہیں راہنما ہے
اُن قافلے والوں سے مری راہ جُدا ہے
کیوں اس کی طرف چشمِ عنایت نہیں ہوتی
کوثرؔ بھی تو منجملۂ اربابِ وفا ہے

○

فطرت کا وُہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے
فریاد! کہ دُنیا کو خدا یاد نہیں ہے

کیا چیز ہے اللہ رے وہ شوخ تبسّم!
اب ایک بھی ظالم کی جفا یاد نہیں ہے

اَب عشق بھلا بیٹھا ہے اخلاص کا انداز
اَب حُسن کو پہلی سی ادا یاد نہیں ہے

کیا مجھ سے ہوئی عرضِ تمنّا میں جسارت
کیوں ہو گئے وہ مجھ سے خفا یاد نہیں ہے

بیمارِ غمِ عشق کا اللہ نگہباں!
اِس آنکھ کو پیغامِ شفا یاد نہیں ہے

صیّاد! نہ کر نغمہ سرائی کے تقاضے
اب مجھ کو گلستاں کی فضا یاد نہیں ہے

اِس "انجمنِ ناز" کو فردائے قیامت
اے کوثرِ افسردہ نوا! یاد نہیں ہے

الف۔ ڈی۔ گوہر

آفت خزاں کی ہو کہ فراغت بہار کی
کروٹ ہے اِک گردشِ لیل و نہار کی

بادہ کشی کی تہمتِ بے جا لیے ہوئے
تلخی مٹا رہا ہوں غمِ روزگار کی!

ہر پھول سرنگوں ہے تمہارے فراق میں
تم اپنے ساتھ لے گئے قسمت بہار کی

موجِ نسیم میرے قفس تک بھی آ گئی
کتنی ستم ظریف روش تھی بہار کی

اے دِل ظہورِ صبح قیامت ہی کیوں نہ ہو
آخر سحر تو ہو گی شبِ انتظار کی

ساقی چھلک رہا ہے پیالوں میں خونِ دِل
اب خیر مانگ میکدۂ روزگار کی

گوہرؔ وُہ آئیں اور بِن آئے نہ رہ سکیں
یہ ضد ہے آج جذبۂ بے اختیار کی

میں چارہ گر سے آنکھ چُراتا چلا گیا
ہر درد کی خلش کو چھُپاتا چلا گیا

حلقے بھی کچھ سنور گئے زلفِ دراز کے
کچھ میں بھی اپنے ہوش میں آتا چلا گیا

میں ایک برگِ گُل کی تمنّا لیے ہوئے
کانٹوں کو بھی گلے سے لگاتا چلا گیا

کچھ بادۂ حیات بھی ناخوشگوار تھی
کچھ میں بھی اس میں زہر ملاتا چلا گیا

اِک نقشِ دلنشیں کی تمنّا میں دستِ شوق
خاکے بنا بنا کے مٹاتا چلا گیا

اِک جُنبشِ نظر بھی مری ہمنوا نہ تھی
میں وارداتِ شوق سُناتا چلا گیا

گوہر فروغِ داغِ تمنّا نہ کم ہوا
دل میں کوئی چراغ جلاتا چلا گیا

احمد ندیم قاسمی

ہنسی آتی ہے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر
گھٹا کعبے سے اُٹھتی ہے، برستی ہے برہمن پر

خمارِ خانہ ویرانی میں یوں محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے بجلیوں نے رنگ چھڑکے ہیں نشیمن پر

چلو دشتِ طلب میں ایک اِنساں تو نظر آیا
جو وہ مانے تو اپنی جاں رکھ دوں دستِ رہزن پر

جفائے دوست کی مجھ سے شکایت ہو تو کیونکر
وُہ دیوانہ ہوں، جس کو پیار آجاتا ہے دشمن پر

شمیمِ گُل تو رنگِ گُل کے بس میں بھی نہیں رہتی
خزاں کیوں ہاتھ پھیلاتی رہی دیوارِ گلشن پر

قفس کی تیرگی کچھ کم تو تھی ہول آفرینی کو
کرن کے رُوپ میں تلوار رکھدی کس نے روزن پر

خدا کے سامنے کس منہ سے جائینگے، خدا جانے
محبّت کا کوئی دھبّہ نہیں ہے جن کے دامن پر

عناصر سے نمٹ کر، کیا بتاؤں، کس سے نمٹے گا
ندیمؔ اب آدمی کے ہاتھ ہیں خود اپنی گردن پر

ایوّب شاہد نسیمؔ

رہا میرے غم کا ساتھی میرے بخت کا ستارا
تری آرزو نے لُوٹا تری جستجو نے مارا!

میں بساطِ زندگی پر غمِ آرزو کی بازی
کبھی اُن کی شہ پہ جیتا، کبھی دِل کی شہ پہ ہارا

تری دِل نوازیوں پر مری زندگی کٹی ہے
مری نامرادیوں نے مجھے بارہا پکارا

اُنہیں ایک بار دیکھا، مگر اُس کے بعد اب تک
نہ ہجومِ اشک اُمڈا، نہ نظر اُٹھی دوبارا

تری کائنات مجھ کو نہ غلط نظر سے دیکھے!
تری شانِ بے نیازی مجھے ہر طرح گوارا

مرے ساتھ جی رہا ہے مرا ذی وقار ساتھی
جہاں پاؤں ڈگمگائے وہیں سے لیا سہارا

میں نسیمؔ جانتا ہوں مرے حُسنِ زندگی کو
غمِ دہر نے بگاڑا! غمِ عشق نے سنوارا

ہوش ترمذی

دیکھے ہیں جو غم دل سے بھلائے نہیں جاتے
اک عمر ہوئی یاد کے سائے نہیں جاتے

اشکوں سے خبردار کہ آنکھوں سے نہ نکلیں
گر جائیں یہ موتی تو اٹھائے نہیں جاتے

ہر جنبشِ دامانِ جنوں جانِ ادب ہے
اس راہ میں آداب سکھائے نہیں جاتے

ہم بھی شبِ گیسو کے اجالوں میں رہے ہیں
کیا کیجئے دن پھیر کے لائے نہیں جاتے

شکوہ نہیں سمجھائے کوئی چارہ گروں کو
کچھ زخم ہیں ایسے کہ دکھائے نہیں جاتے

اے دستِ جفا سر ہیں یہ اربابِ وفا کے
کٹ جائیں تو کٹ جائیں جھکائے نہیں جاتے

اے ہوش غمِ دل کے چراغوں کی ہے کیا بات
اک بار جلا دو تو بجھائے نہیں جاتے

ماہر القادری

اُن کی خوشی یہی ہے تو اچھّا یوں ہی سہی
اُلفت کا نام آج سے دیوانگی سہی

ہر چند نامراد ہوں پھر بھی ہوں کامیاب
کوشش تو کی ہے کوششِ برباد ہی سہی

غنچوں کے دل سے پُوچھئے لطفِ شگفتگی
بادِ صبا پہ تہمت آوارگی سہی

جب چھڑ گئی ہے کاکلِ شب رنگ کی غزل
ایسے میں اِک قصیدۂ رخسار بھی سہی

ماہرؔ سے اجتناب نہ فرمائیں اہلِ دل
اچھّوں کے ساتھ ایک گنہگار بھی سہی

عزیز احمد

چھلکی جو مے تو بن کے شررِ گونجتی رہی
مینا سے تا بہ ساغرِ زر گونجتی رہی

بادل کی سی گرج تھی یہ دُنیا کہیں جسے
جو درمیانِ شمس و قمر گونجتی رہی

تھی جو دعا وہ ابر کے دامن میں چھپ گئی
جو بد دعا تھی بن کے اثر گونجتی رہی

آئی خزاں، طیور تو جتنے تھے اُڑ گئے
نغموں سے پھر بھی شاخِ شجر گونجتی رہی

آغوشِ شب میں پھول تو مُرجھا کے گر گئے
صحنِ چمن میں بادِ سحر گونجتی رہی

تھا کون اجنبی کہ جو آیا چلا گیا
صدیوں تلک اسی کی خبر گونجتی رہی

فریادِ دِل کسی کے دبائے نہ دب سکی!
جب کٹ گئی زباں تو نظر گونجتی رہی

سمجھتے تھے ہم خموش تھی اپنے قدم کی چاپ
کیا جانے کیوں یہ راہ گزر گونجتی رہی

نظیر صدیقی

دولت نصیب ہو تو محبّت خریدیئے
قسمت میں جو نہیں ہے وہ نعمت خریدیئے

بن جایئے کسی کی ضرورت تو خیر ہے
ورنہ پھر آپ اپنی ضرورت خریدیئے

مہلت ملی جو موت سے ہے وہ تو زندگی
اب زندگی سے مرنے کی مہلت خریدیئے

گر چاہتے ہیں آپ محبّت ہو شاد کام
مرنے کا شوق، جینے کی تہمت خریدیئے

بے سُود ہے یہ کام بھی لیکن مفر کہاں
عبرت سرائے دہر میں عبرت خریدیئے

آتی نہیں ہے راس اگر دِل کو بے حسی
پھر دِل کو خون کیجئے، حسرت خریدیئے

یہ کیا کہ دوستوں کی عداوت خرید لی
جینا ہے، دشمنوں کی محبّت خریدیئے

دامن سے ہاتھ، ہاتھ سے دامن چُھٹا نظیرؔ
قربت کی آرزو میں مسافت خریدیئے

ناصر زیدی

جو میری آخری خواہش کی ترجماں ٹھہری
وہ ایک غارتِ جاں ہی متاعِ جاں ٹھہری

یہ غم نہیں کہ میرا آشیاں رہا نہ رہا
خوشی یہ ہے کہ یہیں برق بے اماں ٹھہری

وہ تیری چشمِ فسوں ساز تھی کہ موجِ کرم
وہیں وہیں پہ میں ڈوبا جہاں جہاں ٹھہری

کبھی تھے اس میں مری زندگی کے ہنگامے
وہ اِک گلی جو گزرگاہِ دشمناں ٹھہری

وہی تھی زیست کا حاصل وہی تھی لطفِ حیات
وہ ایک ساعتِ رنگیں جو بیکراں ٹھہری

میں اس کو بھول بھی جاؤں تو کس طرح ناصرؔ
جو شرطِ خاص مرے ان کے درمیاں ٹھہری

کلیم عثمانی

ہے اگرچہ شہر میں اپنی شناسائی بہت
پھر بھی رہتا ہے ہمیں احساسِ تنہائی بہت

اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سمٹے رہیں
ہم نے کر کے دیکھ لی سب سے شناسائی بہت

مُنہ چُھپا کر آستیں میں دیر تک روتے رہے
رات ڈھلتی چاندنی میں اس کی یاد آئی بہت

قطرہ قطرۂ اشکِ غم آنکھوں سے آخر بہ گئے
ہم نے پلکوں کی انہیں زنجیر پہنائی بہت

اپنا سایہ بھی جُدا لگتا ہے اپنی ذات سے!
ہم نے اِس سے دِل لگانے کی سزا پائی بہت

اب تو بسِ دَرد ختم جائے سکوں دِل کو ملے
زخم دل میں آ چلی ہے اب تو گہرائی بہت

شام کے سایوں کی صورت پھیلتے جاتے ہیں ہم!
لگ رہی تنگ ہم کو گھر کی انگنائی بہت

آئینہ بن کے وہ صُورت سامنے جب آگئی
عکس اپنا دیکھ کر مجھ کو ہنسی آئی بہت

وہ سحر تاریکیوں میں آج بھی روپوش ہے
جس کے غم میں کھو چکے آنکھوں کی بینائی بہت

میں تو جھونکا تھا، اسیرِ دام کیا ہوتا کلیم
اس نے زلفوں کی مجھے زنجیر پہنائی بہت

تم حفاظت سے مری تصویر رکھنا اپنے پاس
دن گزرتے جائیں گے صورت بدلتی جائے گی

فطرتؔ کاکوروی

تمہیں نبوتِ وفا دوں اگر بُرا نہ لگے
جگر کے داغ دکھا دوں اگر بُرا نہ لگے

تم آ گئے ہو تو یہ گھر ہے آپ ہی روشن
میں اب چراغ بجھا دوں اگر بُرا نہ لگے

تمہارے وعدۂ فردا، تمہارا عہدِ وفا
میں آج یاد دلا دوں اگر بُرا نہ لگے

جو واقعات فسانے بنا دیئے تم نے
وہ واقعات سُنا دوں اگر بُرا نہ لگے

ذرا ٹھہر کہ تری آستیں سے دامن سے
لہو کے داغ چھڑا دوں اگر بُرا نہ لگے

جو آگ سینے کے اندر ہو تم سے کیسے بجھے
میں آنسوؤں سے بجھا دوں اگر بُرا نہ لگے

پہنچ ہی جائیں گے خود لوگ بات کی تہہ تک
کچھ اپنے شعر سُنا دوں اگر بُرا نہ لگے

یہ حشر ہے تمہیں پہچانتا نہیں ہے کوئی
کہو تو نام بتا دوں اگر بُرا نہ لگے

بہت سے زخم فقط آپ ہی کے نام کے ہیں
اشارۃً میں بتا دوں اگر بُرا نہ لگے

میں ایک دن تری محفل میں داستانِ الم!
فسانہ کہہ کے سُنا دوں اگر بُرا نہ لگے

بکا کیا ہے وہ کِس کِس کے ہاتھ اے فطرتؔ
کہے تو نام گِنا دوں اگر بُرا نہ لگے

دفعتاً ترکِ تعلق میں بھی رسوائی ہے
اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

شہرت بخاری

دِل سے پوچھو کہ یہ حسرت کشِ ساماں کیوں ہے
جس جگہ غم کا گزر ہے وہ بیاباں کیوں ہے

جو قیامت بھی گزرتی ہے گزر جانے دو
دعوئ عشق کیا ہے تو پشیماں کیوں ہے

مرا دُنیا سے تعلق ! کہ توقع رکھوں
تو مری جان ہے تو مجھ سے گریزاں کیوں ہے

حرف جس سے تری پہچان تھی اے آئینہ رُو
میں وہی سنگِ مقدر ہوں تو حیراں کیوں ہے

اِتنا شہرہ ہے تری خوش سخنی کا لیکن
جو تری بزم سے آیا ہے ہراساں کیوں ہے

اب نہ وہ حرف و حکایت نہ وہ اندازِ ادا
دردمندوں کو وگرنہ سرِ درماں کیوں ہے

نبض اتنی ہے کہ سنبھلا نہیں جاتا ہے اب
بے اثر آج فسونِ شبِ ہجراں کیوں ہے

صحبتِ دِل زدگاں میں کبھی آؤ تو کھُلے
مرحلہ جی سے گزر جانے کا آساں کیوں ہے

میرے مالک نے سدا میرا بھرم رکھا ہے!
پھر یہ شہرت، دلِ دیوانہ پریشاں کیوں ہے

شعروں کی ڈکشنری

شعرستان

مختلف عنوانات کے تحت ہزاروں اشعار کا خوبصورت انتخاب

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیبؔ رامپوری

فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
NEW DELHI-110002

رئیس امروہوی

مہجورِ ہر انجمن ہیں ہم لوگ
اپنے ہیں جلا وطن ہیں ہم لوگ

جو سبزہ و برگ سے ہو محروم
وہ شبنمِ بے کفن ہیں ہم لوگ

اے اپنی ہی خلوتوں میں محبوس
شاید تری انجمن ہیں ہم لوگ

خود اپنے وجود میں مقیّد
پابستۂ بے رسن ہیں ہم لوگ

ہر ذرّے میں سامعہ ہے بیدار
کس شخص سے ہم سخن ہیں ہم لوگ

اے عالمِ رنگ رنگ تخلیق!
آزردۂ جان و تن ہیں ہم لوگ

ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ

———•———

راغب مرادآبادی

جادۂ ہستی کے، جب بھی پیچ و خم یاد آئے ہیں
بندہ پرور، آپ کے لطف و کرم یاد آئے ہیں

ہو رہا ہے خیر سے دار و رسن کا اہتمام
بعد اک مدّت کے شاید اُن کو ہم یاد آئے ہیں

تجربوں کا عکس ہے، آئینۂ احساس میں
شادمانی کی تمنّا کی، تو غم یاد آئے ہیں

بارہا، مجبوریوں کی زد میں آیا عشق بھی
ایک دَور ایسا بھی گزرا ہے وہ کم یاد آئے ہیں

جب کوئی چنگیز اُٹھا ہے بن کے طوفانِ ستم
خستگانِ جور کو، اہلِ قلم یاد آئے ہیں

خواجہ حمیدالدین شاہد

تیری یہ بے رُخی کسی کے لیے
مستقل غم ہے زندگی کے لیے

کیا محبت اسی کو کہتے ہیں!
دوستی کی تھی دشمنی کے لیے

تیری الفت میں سب گوارا ہے
جان دے دی، تری خوشی کے لیے

شیشۂ دِل کے توڑنے والے
دل لگایا تھا کیا اِسی کے لیے

وائے قسمت خبر نہ لی جس نے
دِل تڑپتا رہا، اُسی کے لیے

آدمی کا ہے آدمی دشمن!
کیا قیامت ہے آدمی کے لیے

آدمیت کہاں گئی یارو کہ
ہم ترستے ہیں آدمی کے لیے

ظلمتِ شب سے چاند نکلے گا
یہ اندھیرا ہے روشنی کے لیے

حُسن والوں کی ہر ادا شاہدؔ
اِک معمّہ ہے زندگی کے لیے!

خلیل صدیقی

کون بتائے کیا حقیقت اور ہے کیا افسانہ کیا
دِل کی بستی کیا بستی ہے بستا کیا لُٹ جانا کیا

برسوں نے جو رشتے جوڑے، پل بھر نے وہ توڑ دیئے
پیارے! اب ٹوٹے ٹکڑوں سے اپنا جی بہلانا کیا

آج تو جُوں توں کٹ جائے گا، کل کی سوچو کیا ہوگا
جو گزری سو گزر چکی اِترانا کیا، پچھتانا کیا

کیسا طوفاں کیسی بلائیں یارو! یہ بھی سوچو تو
سیکھا ہے مر مر کے جینا، جیتے جی مر جانا کیا

جانے کتنے ڈوبنے والے ساحل پر بھی ڈوب گئے
پیارے! طوفانوں میں رہ کر اتنا بھی گھبرانا کیا

تنہا تنہا جی کے دیکھا، ساتھ بھی جی کے دیکھ لیا
ہم نے کیا سمجھا ہے جینا اوروں کو سمجھانا کیا

سُود و زیاں کی باتیں چھوڑو، اور ہی باتیں چھیڑو بھی
عشق کے ہاتھوں کیا کھویا ہے، کیا پایا دُہرانا کیا

اپنی رام کہانی میں بھی جگ بیتی کا جادو تھا
پلکیں جھپکی جاتی ہیں اب ختم ہوا افسانہ کیا

خلیل رام پوری

ہر کوئی سر اُٹھا کے چلتا تھا
گھر کی بستی تھی گھر کا آٹا تھا

جانے کس بات پر خفا تھا وُہ
آپ جلتا تھا آپ بجُھتا تھا

اُس کے اندر سے بولتا تھا کوئی
جب کبھی مُوڈ میں وہ ہوتا تھا

شاخ سے آم جس طرح ٹپکے
اس طرح مجھ پہ جان دیتا تھا

اوڑھ لی شال کیوں خموشی کی
وہ تو اِک گفتگو کا دھارا تھا

رات سارا مکان ڈول گیا
کیا ہوائی جہاز گذرا تھا!

کھو گیا تھا وہ گہری سوچوں میں
دھوپ کے گھر میں کل اندھیرا تھا

چھوڑ دیتے تھے راستہ دریا
آدمی کا چراغ جلتا تھا

ٹھنڈ تھی ریت کے مکانوں میں
ساربانوں میں پیار پلتا تھا
پھول کھلتے تھے ریگ زاروں میں
ذکر مسجد میں اس کا ہوتا تھا

کوئی سبزے کی لہر تھی شاید
جس نے آرام سے سُلایا تھا
اب وہاں اُونٹ بلبلاتے ہیں
پہلے مُرغابیوں کا ڈیرہ تھا

پیڑ اُگتے تھے اپنی مرضی سے
کوئی تحصیل تھی نہ تھانہ تھا
شہر والے تو بھینک آتے تھے
اُس کو دریا اُٹھائے پھرتا تھا

رنگ کروا دیا تھا شیشوں پر
روز سُورج جو جھانکا کرتا تھا!
ٹیلی ویژن نوازتا ہے اب
پہلے اخبار پر گزارا تھا

جب پلٹتا تھا اس کے گھر سے خلیق
ایک سایہ سا ساتھ ہوتا تھا

حمایت علی شاعر

بہت آسان سہی، راہ یہ دشوار بھی ہے
پسِ دیوار یہاں سایۂ دیوار بھی ہے

وہ چمکتا ہوا تارا کہ شب آثار بھی ہے
سوچیے تو وہی سورج کا پرستار بھی ہے

یہ الگ بات کہ بِک ہی نہیں یوسف ورنہ
بکنا چاہوں تو یہاں مصر کا بازار بھی ہے

وہ بھلا کیسے سکوں پائے کہ جس کی قسمت
دلِ حسّاس بھی ہے، دیدۂ بیدار بھی ہے

نقدِ جاں چھیننے والوں کو خبر ہے کہ نہیں
میرے قبضے میں ابھی دولتِ پندار بھی ہے

یہ عجب کیفیّتِ دل ہے کہ سب کچھ کہہ کر
اِک خلش سی ہے کہ کچھ تشنۂ اظہار بھی ہے

میں تو یوں چُپ ہوں کہ آئے نہ ترے ذوق پہ حرف
جو سخن فہم ہے، غالبؔ کا طرف دار بھی ہے

حفیظ صدیقی

کبھی خود قریبیوں سے نکل، کہ حقیقتوں کا ہو سامنا
دلِ مضطرب! اُسے بھول جا، کہ وہ خواب تھا سو بکھر گیا

ترا کرب اپنی جگہ مگر، نہ عذابِ عمر بنا اسے
کہ ترے خلوص کی آگ سے نہ وہ برف زار پگھل سکا

جہاں سب حقیقتیں ہیچ ہوں، وہاں رشتے نبھتے نہیں کبھی!
اُنہیں آج آپ ہی توڑ دے، جنہیں کل کو لکھا ہے ٹوٹنا

ترے پاس صرف اصول ہیں جو عبث ہیں اُسکی نگاہ میں
دلِ حق پرست نبا بھی دے، کہاں تک چلے گا یہ سلسلہ

وہ ہزار راحتِ جاں سہی، مگر اُس سے بچھڑنے کا دُکھ نہیں
سرِ راہ بھی وہ ملے کہیں تو نظر اُٹھا کے نہ دیکھنا

اگر اس کا راستہ مختلف ہے تو اس کا کوئی بھی غم نہ کر
مری جان! شہرِ مراد کا فقط ایک ہی نہیں راستہ

وہ کہے اگر کہ وہ بے خبر ہے مری وفا سے تو جھوٹ ہے
یہ گلہ بجا ہے کہ میں کبھی لبِ اپنی سطح سے نہ اُتر سکا

اگر عمر جھوٹی شہادتوں کے دفاع ہی میں گزر گئی
تجھے کیا جو بعد میں وقت نے زخمی میں دے دیا فیصلہ

وہی آرزو، وہی خواہشیں، وہی حسرتیں، وہی فاصلے
وہی ایک دشتِ فراق ہے، وہی ایک رنگ سراب کا

چراغِ بزم ابھی جانِ انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خد و خال سے بھی گئے

جلیلؔ قدوائی

نزوروں پہ بہت اب مری آشفتہ سری ہے
یہ حال ہے خود سے بھی مجھے بے خبری ہے

جب سے نہیں آغوش میں وہ جانِ تمنّا
اک سِل ہے کہ ہر وقت کلیجے پہ دھری ہے

اُن کی جو میسّر نہیں شاداب نگاہی
پھُولوں میں کوئی رنگ نہ سبزے میں تری ہے

مانا کہ محبّت کے ہیں دشوار تقاضے
بے یار کے جینا بھی تو اِک دَردِ سری ہے

لپکا ہے یہ اک عمر کا جائے گا نہ ہرگز
اُس گل سے طبیعت نہ بھرے گی نہ بھری ہے

اک اُن کی حقیقت تو مرے دِل کو ہے تسلیم
باقی ہے جو کونین میں وہ سب نظری ہے

آنکھوں میں سماتا نہیں اب اور جو کوئی
کیا جانے بصیرت ہے کہ یہ بے بصری ہے

جاگو گے شبِ غم میں جلیلؔ اور کہاں تک!
سوتے نہیں کیوں؟ نیند تو آنکھوں میں بھری ہے

———•———

پرتو روہیلہ

اپنی ڈیوڑھی جھاڑ میاں تو اپنا آپ سنوار میاں
اپنے ساتھ ہی لے جائے گا، ہر اک اپنا بار میاں
دِل کی کھڑکی کھلتی ہے تو جگمگ جگمگ کرتے ہیں
کثرت کے اس شیش محل میں وحدت کے آثار میاں

رہ رہ کر اس بوجھ تلے میں کب سے پستا جاتا ہوں
چھاتی سے کب میری اُٹھے گا جیون کا انبار میاں
سینہ تو گھائل ہونا تھا اور زخم بھی دل میں لگنے تھے
چاہت کے اس خنجر کی جب اُلٹی ہو گئی دھار میاں

چھاتی اندر آن براجے کیسے عُریانی کے دیو
مجھ سے اپنا حق مانگے پیراہن کا ہر تار میاں
تپتے ٹسک ویرانوں گھومے سورج بیبا ننگے پاؤں
نا اس رستے چھاؤں کہیں، نا اس رستے دیوار میاں

مجبوری کا اس سے بڑھ کر کیا طعنہ ہوگا پرتوؔ
ہنس ہنس کر جب دوست ہی اپنے مجھ کو کہیں مختار میاں

انجم رضوانی

وہ شخص یوں نگاہ میں نگاہ ڈال کر گیا
بجھی بجھی سی زندگی مری بحال کر گیا

وہ سادہ لوح تھا مگر غضب کی چال کر گیا
نہیں جواب جس کا، مجھ سے وہ سوال کر گیا

مجھے تو اپنی جستجو اُس آستاں پہ لے گئی
وہ دشمنِ وفا نہ جانے کیا خیال کر گیا

نہ دو دلوں کا میل تک کے سہہ سکا تو محتسب
خبر یہ ساری شہر میں اچھال اچھال کر گیا

تو آگیا تو ظلمتِ غمِ فراق چھٹ گئی
جو مہر و مہ نہ کر سکے، ترا جمال کر گیا

یہاں نگاہ و فکر کے بدل چکے ہیں زاویے
وفا کی رسم اُٹھ گئی خلوص انتقال کر گیا

شکن شکستِ جبیں نہ کر، اگر اُمیدِ خیر پر
فقیر تیرے در پہ آگیا، سوال کر گیا

یہ سیلِ حسنِ بے حجاب، جھومتی جوانیاں
جو دین و دل بچا کے لے گیا، کمال کر گیا

قدم قدم پہ بتکدے رہِ حرم میں تھے مگر
مرا بچاؤ ذکرِ ربِّ ذوالجلال کر گیا

پیڑ اور پتھر بھی پوجیں تو من کے کنول کھل جائیں
لیکن اپنے سیوک کو بھی ڈس لے یہ انسان

انجم رومانی

کچھ اجنبی سے لوگ تھے کچھ اجنبی سے ہم
دنیا میں ہو نہ پائے شناسا کسی سے ہم

دیتے نہیں سجھائی جو دنیا کے خط و خال
آئے ہیں تیرگی میں مگر روشنی سے ہم

ہاں تو ہر اک قدم پہ خلل ہے حواس کا
اے خضر! باز آئے تری ہمرہی سے ہم

دیتے ہیں لوگ آج اسے شاعری کا نام!
پڑھتے تھے لوحِ دل سے کچھ آشفتگی سے ہم

رہنی ہے انجم ایک زمانے سے گفتگو
کرتے نہیں کلام بظاہر کسی سے ہم!

امین راحت چغتائی

کسی مکاں کے دریچے کو وا تو ہونا تھا
مجھے کسی نہ کسی دن صدا تو ہونا تھا

جسے تمیزِ سروں سے ملے قدو قامت
اُسے کسی نہ کسی دن خدا تو ہونا تھا

مَیں جانتا تھا، جبینوں پہ بل پڑیں گے مگر
قلم کا قرض تھا، آخر ادا تو ہونا تھا

یہ کیا ضرور، پتہ پُوچھتے پھریں اُس کا
ملا ہی یوں تھا وہ جیسے جُدا تو ہونا تھا

وہ پچھلی رات کی خوشبو، رچی رچی سی فضا
سحر قریب تھی، وقتِ دعا تو ہونا تھا

ہم ایک جاں ہی سہی، دل تو اپنے اپنے تھے
کہیں کہیں سے فسانہ جُدا تو ہونا تھا

مَیں آئینہ تھا، چھپاتا کسی کو کیا راحتؔ
وُہ دیکھتا مجھے جب بھی، خفا تو ہونا تھا

اُمیّد فاضلی

یادوں کی گھنی چھاؤں بھی رخصت ہوئی گھر سے
اِک اور سفر کے لیے لوٹ آؤ سفر سے

فطرت کا تقاضا ہے کہ فطرت کا ہو اظہار
خوشبو ہے تو لہرائے، جو بادل ہے تو برسے

پستی کا یہ عالم کہ نظر ابر کی جانب
اور ابر کا یہ حال کہ دو بوند کو ترسے

جل اُٹھتے ہیں یادوں کی منڈیروں پہ سرِ شام
جو خواب بچا لایا تھا جلتے ہوئے گھر سے

اِتنا بھی کم احوال نہ سمجھے مجھے دُنیا
چھلکا ہوا اک حرف ہوں اس دیدۂ تر سے

اندر سے اصولوں کی طرح ٹوٹے ہوئے لوگ
بک جائیں تو دیکھو نہ تعجّب کی نظر سے

یہ لمحۂ موجود کہ تم جس میں ہو زندہ!
ٹوٹا ہوا پتّا ہے زمانے کے شجر سے

یہ دشتِ تمنّا ہے قدم سوچ کے رکھنا
بڑھتا ہے سفر اور یہاں ترکِ سفر سے

دھوکا ہی سہی پیار کے قابل ہے یہ دُنیا
تم نے اسے دیکھا نہیں شاعر کی نظر سے
ہو لاکھ ہوا تیز مگر غم نہیں اُمیّد
لَو حرف کی روشن ہے مرے خونِ جگر سے

یہ کاروانِ جنوں ہے اسے قرار کہاں
بس ایک شب پسِ دیوارِ یار ٹھہرے گا

اِقتدارِ قدرؔ

ہنگامہ دار و گیر کا ہوتا رہا بہت
پایا کسی نے کچھ، کوئی کھوتا رہا بہت
اُٹھا ہوں صبحِ نو کی خبر سن کے دوستو
تسلیم یہ مجھے کہ میں سوتا رہا بہت
آیا تھا اِک خیال کسی مستِ ناز کا
کیا جانیے جو رات میں روتا رہا بہت
پیشانیوں پہ اہلِ ہوس کی چمکتا ہے
وہ داغِ معصیت جو میں دھوتا رہا بہت
بنجر زمیں سے نہ اُگا باوفا کوئی
مہر و وفا کے بیج بوتا رہا بہت
یا رب زمانہ درپئے آزار پھر بھی ہے
کشتی کو اپنی خود میں ڈبوتا رہا بہت
اے قدرؔ تارِ زیست میں آئی نہ تازگی
موتی خلوص کے پروتا میں رہا بہت

افتخار عارف

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دن
جو تھک گیا ہے تو اب اس کو مختصر کر دے

میں زندگی کی دُعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہو سکے تو دعاؤں کو بے اثر کر دے

ہوا کا زہر جڑوں تک پہنچ چکا ہے تو پھر
مری ہری بھری شاخوں کو بے ثمر کر دے

ستارۂ سحری ڈوبنے کو آیا ہے
ذرا کوئی مرے سورج کو باخبر کر دے

قبیلہ وار کمانیں کڑکنے والی ہیں
مرے لہو کی گواہی مجھے نڈر کر دے

بچھڑ گئے ہیں جو مجھ سے انہیں اماں میں رکھ
وہ چاہتے ہیں تو ان کو سپردِ زر کر دے

مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اُجاڑ دے مری مٹی کو در بدر کر دے

یہ اک اشارہ ہے آفاتِ ناگہاں کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

اعجاز رحمانی

اب کرب کے طوفان سے گزرنا ہی پڑے گا
سورج کو سمندر میں اُترنا ہی پڑے گا

فطرت کے تقاضے کبھی بدلے نہیں جاتے
خوشبو ہے اگر وہ تو بکھرنا ہی پڑے گا

پڑتی ہے تو پڑ جائے شکن اس کی جبیں پر
سچائی کا اظہار تو کرنا ہی پڑے گا

ہر شخص کو آئیں گے نظر رنگ سحر کے
خورشید کی کرنوں کو بکھرنا ہی پڑے گا

میں سوچ رہا ہوں بہ سرِ شہرِ نگاراں
یہ اس کی گلی ہے تو ٹھہرنا ہی پڑے گا

اب شانۂ تدبیر ہے ہاتھوں میں ہمارے
حالات کی زلفوں کو سنورنا ہی پڑے گا

اِک عمر سے بے نور ہے یہ محفلِ ہستی
اعجازؔ کوئی رنگ تو بھرنا ہی پڑے گا

اختر انصاری اکبرآبادی

جو تم نے دی ہے اذیت خوشی سی لگتی ہے
یہ دشمنی ہے مگر دوستی سی لگتی ہے!

ہزار صبحیں اندھیروں سے پھوٹ نکلیں گی
یہ تیرگی تو ہمیں روشنی سی لگتی ہے

لبوں پہ ان کے تبسم کی موج ہے شاید
دلوں میں آج نئی زندگی سی لگتی ہے

تمہاری بزم سے اٹھ کر عجیب حال ہوا
ہر ایک شکل مجھے اجنبی سی لگتی ہے

ہر اک ستم پہ میں شکرِ ستم ہی کرتا ہوں
کہ دوستوں سے شکایت بری سی لگتی ہے

مری وفا میں اضافہ سا ہوتا جاتا ہے
نوازشوں میں تمہاری کمی سی لگتی ہے

لگن جو دل میں لگی ہے وہ عارضی تو نہیں
مجھے تو اب یہ خلش دائمی سی لگتی ہے

بہار کہیئے جسے آپ کا سا جلوہ ہے
کلی کے لب پہ ہنسی آپ کی سی لگتی ہے

وہ کہہ رہے تھے محبت سے کل یہ اے اختر
ہر ایک بات تری شاعری سی لگتی ہے

شعروں کی ڈکشنری

شعرستان

مختلف عنوانات کے تحت ہزاروں اشعار کا خوبصورت انتخاب

ترتیب و انتخاب

فرخندہ ہاشمی

نجیب رامپوری

احسن علی خاں

جب تک اتنے قرب سے دیکھا نہ تھا
فاصلوں کے حسن کو سمجھا نہ تھا

زیست تو کیا موت کا یارا نہ تھا
قبر مہنگی تھی، کفن سستا نہ تھا

تجھ سے کیا شکوہ کہ ایسی تھی فضا
تو ہی کیا، ہر آشنا، بیگانہ نہ تھا

سینکڑوں غم ہائے دنیا، کس لیے؟
کیا ترا غم حاصلِ دنیا نہ تھا؟

تو ہی کیا، میں خود نہیں ہوں اپنے پاس
تھا، مگر اتنا کبھی تنہا نہ تھا

بک گئے بازار میں جسم و دماغ
دل وہ باغی تھا کہ بک سکتا نہ تھا

کس نے خیمے کی طنابیں کاٹ دیں
دشت میں تو کوئی ہمسایہ نہ تھا

راہرو چونکے اور آگے بڑھ گئے
میرے گرنے پر کوئی ٹھہرا نہ تھا

بات سچ تھی پر ہنسی میں اُڑ گئی
کہنے والا شخص اِک دیوانہ تھا
ہم بھی احسن کا اڑاتے تھے مذاق
جب تک اپنے آپ میں جھانکا نہ تھا

میں شبِ ہجر کسی شمع کا ممنون نہیں
میری ہی آگ سے روشن ہے شبستاں میرا

احسان دانش

جو اہلِ عشق ہیں نایاب ہوتے جاتے ہیں
یہ زندگی کے حسین خواب ہوتے جاتے ہیں

نشے کی جھانجھ میں پیرِ مغاں کے منصوبے
جواریوں کے حسیں خواب ہوتے جاتے ہیں

وہ ذرے جن پر نہ سورج کی پڑ سکیں کرنیں
تمام کرمکِ شب تاب ہوتے جاتے ہیں

ابھی تو صاحبِ ظرف و ضمیر ہیں کچھ لوگ
مگر یہ لوگ بھی کمیاب ہوتے جاتے ہیں

تھا جس کی گونج سے آبادیوں میں واویلا
زمیں میں جذب وہ سیلاب ہوتے جاتے ہیں

گزر رہے ہیں جو شام و سحر کے ہنگامے
کتابِ وقت کا اک باب ہوتے جاتے ہیں

حلال رزق سے جن کے ضمیر زندہ تھے
وہ اس زمانے میں نایاب ہوتے جاتے ہیں

فضا کو سونپ رہے ہیں معانی و تاثیر
وہ نقش، گم جو سرِ آب ہوتے جاتے ہیں

جھلس گئے تھے لووں سے جو غنچۂ نورس
سحر کے لمس سے شاداب ہوتے جاتے ہیں

پہنچ چکا ہے ستاروں کے مرحلوں میں بشر
جہاز آج بھی غرقاب ہوتے جاتے ہیں

زباں میں شعلۂ دل سے پہنچ رہا ہے جو آگ!
یہ ہاتھ کس لیے برفاب ہوتے جاتے ہیں

بروزِ حشر خدا جانے کیا ہو اسے دانش
ابھی سے نقش مرے اعصاب ہوتے جاتے ہیں

کس شوق سے کہنے بیٹھے تھے ہم الفت کی روداد مگر
کہتے کہتے سانس رکی اور ختم ہوا افسانہ بھی

اثر جلیلی

کیوں لبِ لعلیں کو تیرے میں نے پیمانہ کہا
اس خطا پر میکدہ والوں نے دیوانہ کہا

بڑھ گیا کچھ اور زنداں میں جنوں کا اعتبار
ہر قدم کو وحشیوں نے ایک ویرانہ کہا

عظمتِ دار و رسن اک استعارہ بن گئی
ہم نے یوں بھی قامت و گیسو کا افسانہ کہا

مشورے ترکِ وفا کے تھے بہ عنوانِ خلوص
دشمنی کو ان جہاں والوں نے یارانہ کہا

کم نگاہی اس کی کتنی معتبر تھی دوستو
جس نے نرگس کو حریفِ چشمِ جانانہ کہا!

زندگی بھر جو جلے اُن کی نہ کی دنیا نے قدر
جل مرے جو رات بھر میں ان کو پروانہ کہا

مختصر یہ ہے اثرؔ میری وفا کی داستاں
دوستوں نے دشمن اور اپنوں نے بیگانہ کہا

جگن ناتھ آزاد

غزل

اُن کا رستہ دل کی منزل تک فروزاں کر دیا
وہ جب آئے ہم نے پلکوں پر چراغاں کر دیا

کیا کہوں کتنی کڑی تھیں زندگی کی منزلیں
اے نگاہِ ناز تُو نے اُن کو آساں کر دیا

تُو نے اے ذوقِ تماشا اِک نظر سے کس طرح
گُل کو خنداں کر دیا شبنم کو گریاں کر دیا

یہ مری قسمت ہے میں اُفسردہ دِل ہُوں ورنہ دوست
تُو نے جس گُل پر نظر ڈالی گلستاں کر دیا

ایک قطرہ بھی تو میں دل کو نہ سمجھا تھا کبھی
یاد نے تیری مگر اس کو بھی طوفاں کر دیا

یہ ہے بس جذبِ عبودیت مرا جس نے تجھے
دل کی نظروں سے قریں آنکھوں سے پنہاں کر دیا

بس کہ اے آزاد تھی میری غزل محبوبِ دوست
میں نے ہر تارِ رگِ جاں کو غزل خواں کر دیا

حفیظ جالندھری

ابھی تو مَیں جوان ہُوں

(۱)

ہَوا بھی خوشگوار ہے　　گُلوں پہ بھی نِکھار ہے
ترنمِ ھزار ہے　　بہارِ پُر بہار ہے
کہاں چلا ہے ساقیا
اِدھر تو لوٹ اِدھر تو آ
ارے یہ دیکھتا ہے کیا
اُٹھا سبُو ۔ سبُو اٹھا
سبُو اُٹھا پیالہ بھر　　پیالہ بھر کے دے اِدھر
چمن کی سِمت کر نظر　　سماں تو دیکھ بے خبر
وہ کالی کالی بدلیاں
اُفق پہ ہو گئیں عیاں
وہ اِک ہجومِ مے کشاں
ہے سُوئے میکدہ رواں

یہ کیا گماں ہے بدگماں　　سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیالِ زُہد ابھی کہاں
ابھی تو مَیں جوان ہُوں

(۲)

عِبادتوں کا ذِکر ہے　　نجات کی بھی فِکر ہے
جُنون ہے ثواب کا　　خیال ہے عذاب کا
مگر سُنو تو شیخ جی!
عجیب شے ہیں آپ بھی!
بھلا شباب و عاشقی
الگ ہُوئے بھی ہیں کبھی؟

حسین جلوہ ریز ہوں　　ادائیں فِتنہ خیز ہوں
ہوائیں عِطر بیز ہوں　　تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نِگار ہائے فِتنہ گر
کوئی اِدھر کوئی اُدھر
اُبھارتے ہوں عیش پر
تو کیا کرے کوئی بشر؟
چلو جی قِصّہ مختصر　　تمہارا نقطۂ نظر
دُرست ہے تو ہو۔ مگر
ابھی تو مَیں جوان ہوں

(۳)

یہ گشت کوہسار کی یہ سیر جوئبار کی
یہ بلبلوں کے چہچہے یہ گل رخوں کے قہقہے
کسی سے میل ہو گیا
تو رنج و فکر کھو گیا
کبھی جو بخت سو گیا
یہ ہنس گیا۔ وہ رو گیا
یہ عشق کی کہانیاں یہ رس بھری جوانیاں
اُدھر سے مہربانیاں اِدھر سے لن ترانیاں
یہ آسمان یہ زمیں
نظارہ ہائے دل نشیں
انہیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں!
ہے موت اِس قدر قریں مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں۔ ابھی نہیں
ابھی تو میں جوان ہوں

(۴)

نہ غم کشود و بست کا بلند کا نہ پست کا
نہ بود کا نہ ہست کا نہ وعدۂ الست کا

اُمید وار یاس گُم
حواس گُم قیاس گُم
نظر سے آس پاس گُم
ہمہ - بجز گلاس گُم

نہ مے میں کچھ کمی رہے
قدح سے ہمدمی رہے
نشست یہ جمی رہے
یہی ہمہ ہمی رہے

وہ راگ چھیڑ مُطربا!
طرب فزا اَلم رُبا
اثر صدائے ساز کا
جگر میں آگ دے لگا

ہر ایک لب پہ ہو صدا
نہ ہاتھ روک ساقیا
پِلائے جا - پِلائے جا
ابھی تو میں جوان ہوں

غزل

رئیسہ اشفاق زیدی

وُہ جفا پیشہ کبھی یاد جو آیا ہے مجھے
یاد نے اُس کی شب و روز رُلایا ہے مجھے

ایک اَن جانا سا ہے خوف میرے دل پہ محیط
اپنے سائے نے کئی بار ڈرایا ہے مجھے

ہر گھڑی ایک خلش، ایک چبھن ایک کسک
روگ یہ کیسا محبت نے لگایا ہے مجھے

کشتیٔ شوق کو طوفاں نے ڈبویا ہے وہیں
جب کبھی ساحلِ ارماں نظر آیا ہے مجھے

وہ بھی بیتاب رہے ہیں مری خاطر اکثر
یہ تماشا بھی محبت نے دکھایا ہے مجھے

مَیں ہُوں اب اور مرے بخت کی تاریکی ہے
جب سے اِک دوست نگاہوں سے گرایا ہے مجھے

ایک وہ ہیں جنہیں دیتے ہیں سہارا طوفان
ایک میں ہُوں کہ سہاروں نے گرایا ہے مجھے

جس پہ احسان کرو اس کو نہ اپنا سمجھو
یہی دستور زمانے نے سکھایا ہے مجھے

جذبۂ شوق ٹھہر، اے دلِ بے تاب سنبھل
آج پھر اس نے سرِ بزم بُلایا ہے مجھے

آج اک شوخ نے پھر پیار سے دیکھا ہے رئیسؔ
پھر اندھیرے میں اُجالا نظر آیا ہے مجھے

غزل

مجروح سلطانپوری

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں، وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اُٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اُڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب، نہ میں جنھیں چھو سکا، قدحِ شراب میں ڈھل گئے

تجھے چشمِ مست! پتہ بھی ہے کہ شباب گرمیٔ بزم ہے
تجھے چشمِ مست! خبر بھی ہے کہ جہاں کے طور بدل گئے

وہی آستاں ہے وہی جبیں، وہی اشک ہے، وہی آستیں
دلِ زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

مرے کام آگئی آخرش، یہی کاوشیں، یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

سیف الدّین سیف

آئے تھے ان کے ساتھ نظارے چلے گئے
وہ شب، وہ چاندنی، وہ نظارے چلے گئے

شاید تمہارے ساتھ بھی واپس نہ آ سکیں
وہ ولولے جو ساتھ تمہارے چلے گئے

ہر آشناں اگرچہ تیرا آستاں نہ تھا
ہر آستاں پہ تجھ کو پکارے چلے گئے

شامِ وصال، خانۂ غربت سے رُوٹھ کر
تم کیا گئے، نصیب ہمارے چلے گئے

جاتے ہجومِ حشر میں ہم عاصیانِ دہر
اے لطفِ یار، تیرے سہارے چلے گئے

دُشمن گئے تو کشمکشِ دوستی گئی
دُشمن گئے کہ دوست ہمارے چلے گئے

جاتے ہی اُن کے سیفؔ شبِ غم نے آ لیا
رخصت ہوا وہ چاند، ستارے چلے گئے

جب ترا انتظار کرتے ہیں
تیرے لمحے شمار کرتے ہیں
کوئی وعدہ وفا نہیں کرتے
اور وعدے ہزار کرتے ہیں
جانتے ہیں بتوں کی ہم اوقات
جان پھر بھی نثار کرتے ہیں
تُند جھونکے تمہاری یادوں کے
خاک دل کو غبار کرتے ہیں
تیری آنکھوں کے شبنمی موسم
مجھ کو بھی اشکبار کرتے ہیں
اُن کی عادت کسے نہیں معلوم
دور سے ہم کنار کرتے ہیں
چاک رہتے ہیں ضبط کے پیوند
گو رفو بار بار کرتے ہیں
سارا عالم ہے جن کا شیدائی
وہ ہمیں کب شمار کرتے ہیں
لوگ اچھے ہیں جن پہ وہ مُرشد
مہربانی ہزار کرتے ہیں

میری پسند

مرتبہ :

فرخندہ ہاشمی

ہم نے سیکھا ہی نہیں شکوے شکایت کرنا
ہم تو داغوں کو بھی سینے میں چھپا لیتے ہیں

چاہت کے بدلے میں، ہم بیچ دیں اپنی مرضی تک
کوئی ملے تو دل کا گاہک، کوئی ہمیں اپنائے تو

گُل و گلچیں کا گِلہ، بُلبلِ خوش لہجہ نہ کر
تُو گرفتار ہُوئی اپنی صدا کے باعث

میری جبینِ نیاز ہے جھکنے کے واسطے بیتاب
مگر مجھے کوئی آستاں نہیں ملتا

حیرت ہے کس طرح اُنہیں معلوم ہو گئی!
وُہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں

بھُولی ہوئی سی باتیں یاد آ کے رہ گئیں
بکھرے ہوئے سے تِنکے دیکھے جو آشیاں کے

بھُول جانا تو رسمِ دُنیا ہے
آپ نے کون سا کمال کیا!

آپ بیٹھیں تو سُناؤں میں کہانی دِل کی
یہ سرِ راہ مُلاقات تو کوئی بات نہیں

بس جی رہے ہیں اِتنا غنیمت ہے عدم
کس طرح ہو رہی ہے بسر یہ نہ پُوچھئے

بن کے آنسو میری آنکھوں سے ٹپکتے ہی رہے
راز سینے میں کچھ ایسے بھی چھپائے میں نے

بن کے آنسو میری آنکھوں سے ٹپکتے ہی رہے
راز سینے میں چھپائے بھی چھپائے میں نے

سِن سے اندازہ نہیں ہوتا ہے حصۂ عُمر کا
ہم کو فکروں نے جوانی ہی میں بوڑھا کر دیا

آہوں کی تھپکیوں سے سُلایا ہے اُس کو آج
مطربِ غزل نہ چھیڑ، کہ دل جاگ جائے گا

میرے چہرے کی جُھریوں پہ نہ جا
دِل ابھی تک جوان ہے پیارے

اپنی حالت پہ میں ہنستا بھی رہا ہوں اکثر
اپنے ہی حال پہ آنسو بھی بہائے میں نے

مونس و غمخوار و ہمدم تھا، نہ کوئی راز داں
مَیں کس کو بربادی کا افسانہ سُناتا عمر بھر

دِل کو مِٹے بھی اب تو زمانہ گذُر گیا
اُجڑے ہوئے دیار کی باتیں بھی چھوڑیئے

چراغِ زندگی ہو گا فروزاں، ہم نہیں ہونگے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہونگے

احسان ناخُدا کے اُٹھائے نہ تھے کبھی
شاید اس خیال سے، طوفاں بچا گیا

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہُوئے گھر کی
وہ آئے تو گھر بے سرو ساماں نظر آیا

جُھک نہیں سکتا کسی کے رُوبرو، یہ ناز تھا
حضرتِ دِل آج کہئے، کِس نے سیدھا کر دیا

تو اس قدر مجھے اپنے قریب لگتا ہے
تجھے الگ سے جو سوچوں عجیب لگتا ہے

خُدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا

کوئی ایسا اہلِ دل ہو کہ فسانۂ محبت
میں اُسے سُنا کے روؤں وُہ مجھے سُنا کے روئے

محفلِ بیت بازی

○

شعر و ادب کے شائقین کے لیے حروفِ تہجی کے مطابق 1500
معیاری اور خاص و عام میں مقبول اشعار کا بہترین انتخاب

مُرتبہ
اِعزاز بنتِ نسیم

مدیرہ
ماہنامہ "خاتونِ خانہ" لاہور

فرید بُکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
NEW DELHI-110002

دیوان ظفر
علم مجلسی
کلیات ساحر
کلیات اصغر
کلیات شبلی
ٹاپ
10
ماہ تمام
دیوان غالب
کلیات اقبال